آدھا سچ
نند کشور وکرم

آدھا سچ آدھا سچ آدھا سچ

آدھا سچ

نندکشور وکرم

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی

ISBN 81-88298-17-4

Aadha sach

(short stories)

2007

Price:Rs.150

PUBLISHERS & ADVERTISERS

F-14/21(D), Krishan Nagar, Delhi-110051

Tele: (011)22094419

افسانے

۲۰۰۷

قیمت: ۱۵۰روپے

مطبع: سنجیو آفسیٹ پرنٹرز۔ کرشن نگر، دہلی۔۵۱

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز

ایف ۱۴/۲۱(ڈی) کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

یہ

افسانوی مجموعہ

نہ تو

کسی اکادمی یا ادارے

کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے

اور نہ ہی

کسی

انعام و اعزاز

کی غرض سے

مت سمجھنا کہ مجھے آگ جلا سکتی ہے
مَیں تو ققنس کی طرح راکھ سے پھر جنموں گا

نند کشور وکرم

ترتیب

☆☆☆

آدھا سچ

اُس کے باپ نے اس کا نام شری رام رکھا تھا مگر اسکول میں داخل ہوتے وقت اُس کے نام کے ساتھ شرما بھی جوڑ دیا گیا تا کہ اُس کے نام سے اُس کا برہمن ہونا بھی ظاہر ہو جائے کیونکہ ہمارے ہاں نام کے ساتھ شناخت کے لئے شرما ،ورما، سید، حسینی ،قریشی لکھنے کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ لیکن جب وہ ساتویں آٹھویں جماعت میں تھا تو اُسے شعروشاعری سے رغبت ہوگئی اور چونکہ اُن دنوں پنجاب میں علامہ اقبال کا بول بالا تھا لہذا اُس نے بھی اپنا تخلص اقبآل رکھ لیا اور اقبآل لائکپوری کے نام سے شاعری کرنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اُس کا اصلی نام بھول گئے اور وہ تمام جانکاروں میں اقبآل لائکپوری کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اُن ہی دنوں ایک بار جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیساکھی کے میلے میں گیا تو وہاں لوگ ہاتھ کی پشت پر 'اوم' '۸۶' یا بازو پر اپنا نام لکھوار ہے تھے۔ پہلے تو وہ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا پھر اُس نے بھی بڑے شوق سے اُردو میں اپنا نام شری رام شرما کے بجائے اقبآل لائکپوری لکھوالیا کیونکہ اُسے اقبال نام بہت اچھا لگتا تھا اور جب لوگ اُسے اس نام سے پکارتے تھے تو اُس کا سر فخر سے تن جاتا تھا۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ لائل پور سے لاہور چلا آیا کیونکہ اُن دنوں لاہور ایک اہم تجارتی شہر ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑا ادبی اور تہذیبی مرکز بھی تھا جہاں بڑے بڑے فنکاروں کا اجتماع رہتا تھا اور چونکہ یہاں آنے سے پیشتر اُس کی کچھ نظمیں غزلیں وہاں کے رسائل میں شائع ہو چکی تھیں اس لئے یہاں اُسے اپنا گزارہ چلانے کے لئے ایک مشہور ناشر کے پاس جو زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، چالیس روپے ماہوار پر پروف ریڈنگ اور تبصرے اور اداریے لکھنے کی ملازمت مل گئی۔

وہ لائلپور کے ایک کٹر برہمن پریوار میں پیدا ہوا تھا لیکن اسکول کے زمانے میں ہی اُسے کچھ ایسے ساتھی مل گئے جن کی رفاقت میں وہ چھوت چھات سے نفرت کرنے لگا تھا اور لاہور کی کھلی فضا میں تو اُس کے خیالات میں مزید وسعت آ گئی۔ اس کے علاوہ کچھ ترقی پسند ادیبوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اُن کے خیالات و نظریات کا بھی اُس پر اثر پڑا جس سے اُس پر اشتراکی خیالات کا غلبہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی تحریروں میں شدت بھی آ گئی۔

ایک بار اُس نے اُردو کے مشہو کہانی نویس اور ناول نگار ایم کلام کے تازہ ترین ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بجائے کہ وہ ایک بہت ہی زود نویس ناول نویس ہیں، لکھا کہ ایم کلام ایک ایسی کتیا ہے جو سال میں درجنوں بچے دیتی ہے۔ اس طرح کا غیر اخلاقی اور اشتعال انگیز تبصرہ چھپنا تھا کہ چاروں جانب اس کے چرچے ہونے لگے اور جب کلام صاحب نے اس تبصرے کو پڑھا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً اپنی بندوق اُٹھائے ناشر چوہدری شوکت علی کی دکان پر پہنچ گئے اور غصے سے تلملاتے ہوئے بولے۔ ”کہاں ہے وہ تمہارا تبصرہ نگار اقبال لائلپوری؟“

چوہدری شوکت صورتِ حال سے آگاہ نہ تھا کیونکہ اُس نے تو تبصرہ پڑھا ہی نہیں تھا اس لئے وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''حضور! کیا اُس لونڈے سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟

''غلطی۔ارے غلطی کیا اُس نے تو بدتمیزی کی ہے۔مَیں اسے جان سے مار دوں گا۔''

''آخر اُس نے لکھا کیا ہے؟''

''کیا تم اپنے رسالے کے مضمون اور تبصرے پڑھے بغیر چھاپ دیتے ہو؟'

ویسے تو چوہدری شوکت کبھی بھی اپنے رسالے کے مضامین پڑھا نہیں کرتا تھا اور سارا کام اس کے مدیر ہی کیا کرتے تھے لہٰذا اُس نے کہا'' جی یہ کام زیادہ تر میرے رسالے کا ایڈیٹر یا اس کے معاونین ہی کرتے ہیں۔''

''اس پر وہ گرج کر بولے بند کرو یہ رسالہ ورنہ میں تمہارے کتب خانے اور دفتر کو آگ لگا دوں گا۔

چوہدری شوکت بھی بڑا گھاگ آدمی تھا، اُس نے کلام صاحب کو غصہ میں دیکھتے ہی نوکر کو ٹھنڈی لسی لینے کے لئے بھیج دیا۔ پھر اُس نے منت وسماجت کر کے انہیں کرسی پر بٹھایا اور کچھ لمحوں بعد جب نوکر لسی لے کر آیا تو اُس نے بڑے مودبانہ انداز میں اُن کی خدمت میں پیش کی۔ لسی پینے کے بعد جب اُن کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور انہوں نے تمام تفصیل بیان کی تو اُس نے اپنی اور اقبال کی جانب سے معافی مانگی اور بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کر کے گھر کی جانب روانہ کیا۔

لیکن پھر بھی اس تبصرے سے لگے کاری زخم کو وہ بھلا نہ پائے اور جب

ایک دن اتفاقاً ایک تقریب میں اُن کا اُس سے آمنا سامنا ہوا اور کسی ادیب نے اُس سے اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ۔ ''کلام صاحب یہ نوجوان شاعر اقبال لائکپوری ہیں' تو غصے کی شدت سے اُن کا پارہ نہائی ڈگری تک جا پہنچا اور انہوں نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا۔ ''تو تم ہی ہو اقبال لائل پوری! جس نے میرے خلاف وہ واہیات تبصرہ لکھا تھا۔؟''

اقبال کو کلام صاحب کے غصے کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا اور وہ اُن سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن آج اچانک یوں پھنس جانے پر وہ خوف و ہراس سے کانپ اُٹھا۔ لیکن پھر موقع کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بڑے عجز و انکسار سے بولا۔ ''حضور! اس میں میرا ذرا بھی قصور نہیں۔ مَیں تو چوہدری شوکت علی کا ملازم ہوں وہ جو مجھے کہتے ہیں مَیں لکھ دیتا ہوں۔''

اُس کی انکساری اور ہاتھ جوڑنے سے کلام صاحب کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور اسی بیچ میں اچانک کلام صاحب سے کوئی اور ملنے آ گیا اور بات آئی گئی ہو گی۔

لیکن تقسیم وطن سے پیشتر ایک دن جب وہ لاہور کے مسلم علاقے شاہ عالمی گیٹ سے گزر رہا تھا کہ اچانک فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا اور آناً فاناً ساری دکانیں بند ہو گئیں اور لوگ جلدی جلدی محفوظ مقامات کی طرف دوڑ پڑے، لیکن وہ تو اپنے گھر سے بہت دُور تھا لہٰذا اندر ہی اندر وہ خوف و دہشت سے کانپ اٹھا کہ اگر کسی کو ذرا بھی اُس کے ہندو ہونے کی بھنک پڑ گئی تو اُس کی خیر نہیں۔ اس لئے وہ جلدی جلدی اس علاقے سے نکل کر ہندو علاقے میں پہنچنے کے لئے بڑے بڑے ڈگ بھرنے لگا کہ اچانک چند بلوائیوں نے اُسے گھیر لیا اور بڑی بدتمیزی سے پوچھا ''ابے

کیانام ہے تمہارا؟''

''اقبال'' اُس نے ساری ہمت بٹور کر کہا۔

''اقبال'' تو گویا تم مسلمان ہو؟''

اقبال سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دے اگر سچ بولتا ہے تو جان سے جاتا ہے اور جھوٹ بولنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ تبھی اُسے اپنے بازو پر لکھے اپنے نام اقبال کا خیال آ گیا اور اُس نے اپنا بازو دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو میرا نام۔'' لیکن ابھی وہ نام ہی پڑھ رہے تھے کہ چانک سامنے سے کلام صاحب آتے ہوئے دکھائی دئے جن کے ساتھ اُن کے دو تین ملازم اور دو کتے بھی تھے اور جو شاید ابھی ابھی شکار سے ہی لوٹ کر اپنے گھر کی جانب جا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُسے اپنی زندگی کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی، اُسے اپنا خاتمہ سامنے دکھائی دینے لگا کیونکہ وہ تو اُسے سبق سکھانے کے لئے کب سے موقع ڈھونڈ رہے تھے اور بھلا اس سے اچھا موقع انہیں کہاں مل سکتا تھا؟ علاوہ ازیں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایک ہندو ہے۔ پاس آ کر جب انہوں نے اقبال کو یوں بلوائیوں میں گھرا ہوا دیکھا تو فوراً آواز دی۔

''ارے اقبال! تم کہاں گھوم رہے ہو۔ چلو گھر چلو'' اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا وہ اُسے لے کر گھر کی جانب چل پڑے۔ اور وہ سارا راستہ یہی سوچتا رہا کہ آج میں کلام صاحب کے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکوں گا اور وہ میرے اُس مضمون کا بدلہ ضرور لیں گے۔ اور شاید میری موت ان ہی کے ہاتھوں لکھی ہوئی تھی۔

وہ یہی سوچتا سوچتا اُن کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن دل میں خوف و دہشت

نے اسے بُری طرح سے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُس کا حشر کیا ہوگا؟

راستہ بھر کلام صاحب نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ لیکن گھر جاتے ہی انہوں نے اپنے ایک نوکر کو آواز دے کر کہا کہ اُسے لے جا کر بالائی منزل کی کوٹھری میں بند کر دو۔

کوٹھری کا نام سنتے ہی اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کرتا بھی تو کیا کرتا؟ مجبوراً خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ملازم نے جا کر بالائی منزل پر واقع کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اُسے بند کر کے پھر نیچے چلا گیا۔

اقبال کو وہ تاریک کوٹھری پھانسی کی کوٹھری محسوس ہونے لگی جہاں قیدی کو سزائے موت سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ وہ اُس اندھیری کوٹھری میں بند سوچنے لگا۔ آہ آج اُس کی زندگی کا آخری دن ہے اور موت کے بعد کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میری موت کیسے ہوئی؟ میری لاش کا کیا ہوا؟ اُسے اُٹھا کر گلی میں پھینک دیا گیا۔ یا۔۔۔۔

اچانک اُس کے خیالات کا تانتا ٹوٹا۔ کلام صاحب کا وہی ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک دوسرا شخص کھانا لئے کھڑا تھا۔ اُس نے آتے ہی کھانے کی طشتری چھوٹی سی میز پر رکھ دی اور اُسے کھانے کے لئے کہہ کر پھر دروازہ بند کر کے نیچے چلا گیا۔

اقبال انتہائی کوشش کے باوجود کھانا نہ کھا سکا۔ کیونکہ وہ تو سوچ رہا تھا کہ جس طرح قربانی سے پیشتر بکرے کو خوب کھلایا پلایا جاتا ہے، شاید اُسی طرح ہلاک

کرنے سے پہلے اُس کی آؤ بھگت کی جا رہی ہے اور اُس کی کسی بھی وقت موت واقع ہو سکتی ہے۔ان ہی خیالات میں اُلجھے اُلجھے رات بیت گئی اور قریب ہی کی کسی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آنے لگی۔ وہ حیران تھا کہ رات بیت گئی ہے اور وہ ابھی تک زندہ صحیح سلامت ہے؟ وہ ابھی انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ملازم نے اندر آ کر کہا۔

''چلئے جناب! آپ کو خان صاحب بلا رہے ہیں''۔

خان صاحب کا نام سُن کر وہ خوف و دہشت سے کانپ اُٹھا، لیکن وہ کرتا بھی تو کیا کرتا؟ وہ تو اُن کی قید میں تھا اس لئے وہ اندر سے سہا ہوا بھیگی بلی کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔جب وہ نیچے پہنچا تو خان صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے سامنے چائے کی ٹرے پڑی تھی۔اُسے دیکھتے ہی وہ بولے''ارے آؤ اقبال! بیٹھو۔چائے پیو۔معاف کرنا رات تمہیں کوٹھری میں دقت تو ضرور ہوئی ہوگی مگر وہاں تمہیں اس لئے بند کرنا پڑا کہ گھر میں آنے جانے والوں میں سے کسی کو تمہارے یہاں ہونے کا پتہ نہ چل جائے۔اچھا اب چائے پیو۔اور جلدی سے گھر جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔کرفیو دو گھنٹے کے لئے کھلا ہے اس لئے میرے ملازم تمہیں ہندو علاقے تک چھوڑ آئیں گے۔

کلام صاحب کے اصرار پر اُس نے بڑی مشکل سے چائے کے چند گھونٹ بھرے اور پھر اُن کا شکریہ ادا کر کے اُن کے دو ملازموں کے ساتھ باہر گلی میں نکل آیا۔ملازم اُسے ساتھ لئے لئے ہندو علاقے کی جانب چل پڑے اور جب ہندو علاقہ شروع ہوا تو وہ اُسے سلام کر کے وہیں رک گئے اور تب تک رکے رہے جب تک

کہ وہ ہندو علاقے میں داخل نہیں ہو گیا۔

اور اُس وقت کلام صاحب کے تئیں اُس کے دل میں احسان مندی کا ایک ناقابلِ بیاں جذبہ موجزن تھا اور اُس کا سر اُن کے احسان سے سرنگوں ہو گیا تھا۔

مدتوں بعد وقت کا چکر یوں ہی چلتے چلتے دوبارہ اُسی مقام پر پہنچ گیا......

حالات نے پھر اُسے فساد کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ اب وہ ہجرت کر کے ہندوستان میں آبسا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا تھا۔ اسی لئے جب وہ اپنے کام کے سلسلے میں دہلی سے کئی سو میل دور اپنے ٹور (TOUR) کے دوران اچانک فساد کی مسموم ہواؤں میں گھر گیا تو اُسے کوئی خوف و ہراس محسوس نہیں ہوا کیونکہ وہ ایک ہندو علاقے سے گزر رہا تھا۔۔ فساد

کے باوجود اس کے من میں کوئی خوف ......کوئی دہشت نہیں تھی۔ لیکن اس کی صورت مقامی لوگوں سے الگ تھلگ سی تھی اور اُس کے لباس نے تو اُس کی شناخت کو مشتبہ بنا دیا تھا جس کے کارن اچانک کچھ بلوائیوں نے اُسے چاروں جانب سے گھیر لیا اور پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''مَیں ......مَیں ہندو ہوں؟''

''دکھتے تو نہیں ہو''

جناب مَیں سچ کہتا ہوں۔ مَیں ہندو ہوں''

''اچھا تو تم ہندو ہو؟'' ایک بلوائی نے اسے شک و شبہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو تمہارا نام کیا ہے؟

وہ صورتِ حال سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بڑے فخر سے کہتا۔ ''اقبال لائلپوری'' لیکن اس وقت تو اُسے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لئے بڑی سہمی ہوئی آواز نے اس کی زبان سے نکلا۔

''شری رام''

''ابے 'شری رام'...... 'جے شری رام' کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جلدی سے اپنا صحیح نام بتا۔

''جی شری رام شرما''

اچھا تو اب شرما بھی لگالیا لیکن تم ہندو تو دکھائی نہیں دیتے اور یہ شلوار......؟''

جناب شلوار تو ہم بچپن ہی سے پہنتے آ رہے ہیں۔''

اس سے پہلے کے اُس سے کوئی اور سوال کیا جاتا۔ اچانک ایک بلوائی کی نظر اُس کے ہاتھ پر اُردو میں لکھے نام پر پڑ گئی۔ اور وہ چیخ اُٹھا ''نیتا جی یہ تو مسلمان ہے۔ اس کے تو ہاتھ پر اُردو میں نام بھی لکھا ہوا ہے۔''

اچھا۔ سالا جھوٹ بولتا ہے۔' اور اس کے ساتھ ہی کچھ کہے سنے بغیر ایک بلوائی نے اپنی

سونتی ہوئی تلوار اُس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اور اسی اثنا پولیس کی گاڑی کا سائرن بج اُٹھا۔ گاڑی کو دیکھتے ہی تمام بلوائی ساتھ کی گلی میں گھس کر اپنے اپنے گھروں میں جا چھپے۔ پولیس جب موقع واردات پر پہنچی تو اُس نے وہاں ایک تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھا جو اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈی ہو گئی۔ اُس لاش کے ڈیل ڈول اور لباس سے وہ اُس جگہ کا باشندہ نظر نہیں آتا تھا۔ ابھی وہ اُلٹ پلٹ کر اُسے دیکھ ہی رہے تھے کہ

اچانک ایک پولیس والے کی نظر اُس کے ہاتھ پر کھدے ہوئے اُردو نام پر پڑ گئی اور
چونکہ اُن میں سے کوئی بھی اُردو نہیں جانتا تھا لہٰذا وہ اُس لاش کو اُٹھا کر پولیس چوکی لے
آئے تا کہ کسی اُردو جاننے والے سے اُس کا نام پڑھوایا جا سکے۔اور پھر دوسرے دن
تمام اخبارات میں شہ سرخیوں سے یہ تہلکہ خیز خبر شائع ہوئی کہ......

''کل شام ایک خطرناک پاکستانی دہشت گرد اقبال پولیس سے مٹھ بھیڑ
میں ہلاک ہو گیا ہے جو پاکستان کے شہر لائلپور حال فیصل آباد کا رہنے والا تھا۔''

☆☆☆☆☆

آوارہ گرد

شام کو جب سورج مغربی اُفق کے اُس پار غائب ہوگیا اور تاریکی چاروں طرف مسلط ہونے لگی تو اُس نے ناامیدی کے عالم میں ایک سرد آہ کھینچی اور گھر کی طرف چل پڑا۔

مال کی نیلی بتیاں روشن ہوچکی تھیں سینکڑوں حسین وجمیل جوڑے چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ریستوراں کے ریڈیو اُونچی آواز میں چیخ رہے تھے اور بس اسٹینڈ پر کھڑے کئی مسافر بس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ایک شکست خوردہ جواری کی طرح سر جھکائے گھر جارہا تھا اور رہ رہ کر اُسے یہ خیال ستارہا تھا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوگا تو گھر کے تمام افراد ایک ساتھ چلا اُٹھیں گے" آ گئے آوارہ گرد!" اور اُس وقت وہ شرم وندامت سے گردن جھکادے گا؟ یا......

ویسے وہ اپنے واقفکاروں کی نظر میں ایک قابلِ فخر ہستی تھا اور سینکڑوں لوگ اُس سے ملنے کے مشتاق تھے کیونکہ وہ ایک مشہور جانا مانا افسانہ نگار تھا اور اُس کے افسانے چوٹی کے رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ اس لئے جب کبھی اُس کا کسی سے تعارف کرایا جاتا تو بڑے فخریہ انداز میں کہا جاتا۔" یہ ہیں انور صدیقی صاحب۔

مشہور افسانہ نگار'' اور متعارف ہونے والا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کے چہرے کا مطالعہ کرنے لگتا جیسے اُسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہی دبلا پتلا چھوکرا ہی انور صدیقی ہوسکتا ہے جس کے کئی افسانے وہ بارہا پڑھ چکا ہے اور جس سے ملنے کا وہ متمنی تھا۔

یہ سب کچھ تھا مگر وہ اپنے گھر والوں کی نظر میں صرف ''آوارہ گرد'' ہی تھا۔ کیونکہ بی اے ہونے کے باوجود بھی وہ کہیں نوکری حاصل نہیں کرسکا تھا اور بیکار تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ جان بوجھ کر نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ وہ صرف بغیر محنت کے گھر کے ٹکڑوں پر پلنا چاہتا ہے اس لئے وہ اُسے ''آوارہ گرد'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ حالانکہ اُس کی دلی آرزو تھی کہ وہ جلد از جلد برسرِ کار ہوجائے تاکہ وہ اُن کی جھڑکیوں سے نجات پاسکے مگر بدقسمتی سے بہت جستجو کے باوجود بھی وہ آج تک کہیں نوکری حاصل نہیں کرسکا تھا۔

آج سے کچھ عرصہ پیشتر اُس کا خیال تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت یار دوستوں سے ہزار دو ہزار کی مالی امداد حاصل کرسکتا ہے اور نوکری تو جب چاہے بآسانی پاسکتا ہے۔ مگر آج اُسے معلوم ہوا کہ حصولِ نوکری تو ایک دشوار ترین مسئلہ ہے۔ اس کے لئے سفارش چاہیئے ...... یا رشوت۔ اگر سفارش نہیں تو انسان ڈگریوں کے باوجود نوکری حاصل نہیں کرسکتا اور اگر سفارش ہو تو بغیر کسی دقت کے چاہے میٹرک پاس ہی کیوں نہ ہو، نوکری مل جاتی ہے۔ اور دوست .... دوست مدد نہیں کرتے۔ بلکہ وقت پڑنے پر بہانے تراشنا ہی جانتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا احساس اُسے آج ہو رہا تھا جب اُسے اپنی بہن نیلم کی بیماری کے علاج کے لئے روپوں کی اشد ضرورت تھی ...... کیونکہ اُسے نیلم سے بے حد پیار تھا۔ اور گھر میں صرف نیلم ہی تھی جس نے کبھی

اُسے آوارہ گرد نہیں کہا تھا اور جو اُس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھی۔اور پھر نیلم کا خیال آتے ہی اُسے احساس ہونے لگا کہ جب وہ گھر کی دہلیز پر قدم رکھے گا تو وہ اس دنیا میں نہیں ہوگی بلکہ کسی اور دنیا میں پہنچ چکی ہوگی۔

''ارے انور!''

ایک جانی پہچانی آواز نے اُس کے خیالات کا تانتا توڑا اور اُس نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔فرنٹیر ہوٹل میں بیٹھا اُس کا ایک شاعر ساتھی نسیم چائے پی رہا تھا۔انور کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کرے لیکن نسیم کے اصرار کی وجہ سے اُس نے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنا منظور کرلیا۔نسیم نے ہوٹل کے نوکر کو چائے کا ایک کپ لانے کا آرڈر دیا اور پھر بولا: ''ارے یار! تم تو ملتے ہی نہیں۔سناؤ آج کل کیا لکھ رہے ہو؟''

'''خانگی پریشانیوں کے باعث میں کچھ لکھ نہیں سکا۔'' انور نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیوں بھئی! آخر کیا بات ہے؟::

''بھئی! میری بہن نیلم بہت بیمار ہے اور اِسی وجہ سے دن رات پریشان رہتا ہوں''

''اوہو! نسیم نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''کیا بیماری ہے اُسے؟''

''سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔پہلے تو اُسے کچھ ہضم نہیں ہوتا تھا پھر جلاب بھی شروع ہوگئے اور اب تو اُس کے پاؤں بھی سوج گئے ہیں۔میرے خیال میں بچنا محال ہے۔''

''خدا رحم کرے'' اچھا میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔'' پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا۔'' ارے ہاں انور! ان دنوں مَیں نے ایک نظم لکھی ہے ''نیا سماج'' سنو گے؟''

انور کا جی چاہتا تھا کہ وہ اُسے صاف الفاظ میں کہہ دے کہ مَیں اس وقت پریشان ہوں، تمہاری نظم نہیں سُن سکتا، مگر پھر اُس کا دل رکھنے کے لئے اُس نے کہا۔'' سناؤ''

نسیم نے جیب سے ایک پرانا کاغذ نکالا اور کھنکار کر اُونچے لہجے میں نظم پڑھنے لگا۔ مگر انور نے نظم کا ایک لفظ بھی ٹھیک طرح سے نہیں سنا کیونکہ وہ تو سوچ رہا تھا کہ کب نظم ختم ہو اور وہ نسیم سے کچھ روپے اُدھار مانگے۔ اس لئے جب نسیم نے نظم کا آخری بند پڑھا اور اُس کی رائے جاننے کے لئے پوچھا کہ'' کیوں کیسی تھی؟'' تو انور نے چونک کر جواب دیا ''بہت اچھی'' حالانکہ نظم اُس نے سنی ہی نہیں تھی اور پھر بولا۔'' نسیم! ایک بات کہوں؟''

''کہو کیا بات ہے؟''

''یار اگر کچھ دن کیا لئے ایک ہزار روپے عنایت کر دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ مَیں تم سے ہرگز نہ مانگتا مگر کیا کروں کافی دوڑ دھوپ کرنے کے باوجود بھی مَیں کہیں نوکری حاصل نہیں کر سکا اور نیلم کے علاج کے لئے روپوں کی سخت ضرورت ہے۔''

روپوں کا نام سنتے ہی نسیم کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ بمشکل اتنا کہہ پایا۔'' مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے مگر میں مجبور ہوں دوست! میرے پاس ڈیڑھ

ہزار روپے تھے مگر میں نے آج ہی بیوی کو سسرال بھیج دیے ہیں۔"

ٹکا سا جواب سُن کر انور کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی۔نسیم سے اُس کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن آج اُس سے بھی وہ دوسروں کی طرح ناامید ہوگیا۔نسیم تین چار ہزار روپے مہینے پر سکرٹیریٹ میں ملازم تھا اور اُس کا کئی ہزار بنک میں جمع تھا جس کا ذکر اُس نے کئی بار کیا تھا لیکن آج صاف مکر گیا۔

اُس کا دل بار بار اُسے کوستا۔اور کہتا۔"ادیب بن کر تم نے گھر والوں کو کیا فائدہ پہنچایا ہے یا تمہیں کیا فائدہ پہنچا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں؟ کیونکہ تمہیں کبھی افسانوں کا معاوضہ تک نہیں ملا۔حالانکہ رسائل کے پبلشر ایڈیٹر سے لے کر کاتب تک کو معاوضہ دیتے ہیں مگر ایک ادیب ہی تو ہے جو کہ دماغی کاوش کے علاوہ اپنی تخلیق بھیجنے کا خرچ بھی جیب سے ادا کرنا پڑتا ہے اور اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔وہ شہرت کس کام کی؟ وہ آرٹ کس کام کا جو آرٹسٹ کو بھوکوں مرنے پر مجبور کرے؟ ایک تاریک موڑ سے گزرتے ہوئے اُس نے سوچا۔ادیب ہونے سے تو پکوڑے بیچنا اچھا ہے۔جس میں سوڈیڑھ سو روپے یومیہ کی آمدن ہوجاتی ہے۔

تاریکی میں اُسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔جیسے موت اُس سے نیلم کا پتہ پوچھ رہی ہو۔اُس نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور سوچنے لگا......افسوس نیلم نہیں بچے گی۔وہ ضرور بستر پر تڑپتی تڑپتی دم توڑ دے گی اور پھر گھر میں کہرام مچ جائے گا۔امی چلائیں گی......ہائے میری بچی ہائے میری نیلم اور ابا کی دہاڑیں سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیں گی۔

نیلم کا خیال اُسے رہ رہ کر ستاتا تھا۔وہ سوچتا کہ ابھی کچھ مہینے پہلے کی بات

ہے وہ بالکل تندرست وتوانا تھی، پھر وہ اچانک بیمار ہوگئی اور مرض بڑھتا ہی گیا اور آج یہ حالت تھی کہ اُس کے جسم میں خون کا نام ونشان نہیں۔ ٹانگیں سوج کر کُپا ہوگئی ہیں اور وہ بول براز بیٹھنے تک سے بھی قاصر ہے۔ اس کی ایسی ناگفتہ بہ حالت نے ہی اُسے مجبور کردیا تھا کہ وہ کوئی بھی نوکری کرلے کیونکہ ابا کی قلیل آمدنی میں علاج نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ڈاکٹر نہتائی مہنگی دوایں تجویز کر رہا تھا لہذا وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد کہیں سے روپوں کا انتظام ہوجائے تاکہ شاید ڈاکٹر کے بتائے ٹیکوں اور دواؤں سے نیلم بچ جائے۔ مگر افسوس نہ تو نوکری ملی اور نہ ہی روپے۔

گھر کی گلی قریب آچکی تھی۔ وہ نظریں جھکائے اکرم پان فروش کی دکان کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا تاکہ وہ گلی میں بیٹھے محلے کے ان نوجوانوں سے بچ جائے جو دن بھر بیٹھے گلی کی بہو بیٹیوں پر آوازے کستے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی شریف کہلاتے ہیں کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح سے کچھ کما لیتے ہیں۔ لیکن وہ ''آوارہ گرد'' اور ''نکما'' تھا کیونکہ برسرِ روزگار نہیں تھا۔ اُسے دیکھ کر دینو جوئے باز نے آواز دی۔

''افسانہ نویس صاحب!'' اور پھر آہستہ آہستہ اپنے ہمیشہ کے ساتھی سے کہا ''یہ چھوکرا جو آرہا ہے ہندوستان کا مشہور افسانہ نویس ہے۔'' اور جب انور قریب آگیا تو اُس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے صاحب! آپ تو ہم لوگوں سے بات کرنا بھی ہتک سمجھتے ہیں۔''

''نہیں صاحب یہ بات نہیں بلکہ مَیں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔''

''اچھا سنائیے۔ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟'' دینو نے ایسے پوچھا جیسے ادب سے اُسے بڑا لگاؤ ہو۔

”کچھ نہیں۔ آج کل ایسے ہی پریشان ہوں۔“

”پریشان؟ آخر کیا بات ہے صاحب؟“

”کچھ نہیں۔ ویسے ہی۔“ انور نے بات ٹالی۔

”اچھا تو بیٹھئے۔ پان کھا لیجئے۔“

”نہیں صاحب معاف فرمائیے۔ مجھے جلدی ہے۔“

یہ کہہ کر انور گھر کی طرف چل پڑا، گھر کے قریب آنے کا خیال آتے ہی وہ کانپ اُٹھا جیسے وہ گھر نہیں جزائر انڈیمان جا رہا ہو۔ اور اُس کے کانوں میں آوازیں گونجنے لگیں۔ ”آوارہ گرد...... آوارہ گرد“ لیکن پھر وہ نیلم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کے دل میں نیلم کے بارے میں کئی اچھے بُرے خیال چکر لگانے لگے۔ اُس کا دماغ ان تمام مصائب کا ایک ہی حل پیش کرتا تھا۔ ایک ایسا سماج وادی نظام جہاں نوجوانوں کو نوکری کے لئے دَر دَر نہ بھٹکنا پڑے، جہاں مریضوں کے لئے صرف خیراتی ہسپتال ہی نہ ہوں بلکہ بہترین خوراک، ہوادار کمرے اور مفت دوائیں بھی دستیاب ہوں جہاں غربت سسک سسک کر دم نہ توڑے۔ ایسی باتیں سوچتے سوچتے وہ گھر کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اچانک اُسے اپنے پڑوسی میاں عبدالغنی مل گئے۔ وہ بولے۔ ”ارے انور!“

میاں جی کی کرخت آواز سے وہ کانپ اُٹھا اور اُس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے میاں جی؟“

”کہاں گیا تھا اتنی رات کو؟“

”بس یوں ہی...... کیوں؟“

''تو تو آوارہ گردی ہی کرتا رہتا ہے اور گھر میں..........''

''......اور گھر میں کیا مولوی صاحب؟''

انور کی آنکھوں کے سامنے معصوم نیلم کی تصویر گھوم گئی۔ اُس نیلم کی جس نے ابھی اس جہان میں کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کے ساتھ اس کی ہزاروں حسرتیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

مولوی صاحب کی آواز بھر آئی اور وہ مایوس کن انداز میں بولے۔ ''بیٹے نیلم کا آخری وقت آپہنچا ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تو کیا واقعی نیلم اس دنیا میں نہیں رہے گی؟ کیا وہ عین عالمِ شباب میں موت کے ظالم چنگل میں پھنس جائے گی؟ اُس کی امیدیں.........اُس کے ارمان پورے ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے؟ تو کیا غریب اسی طرح سسک سسک کر دم توڑتے رہیں گے اور ان کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا جائے گا؟ کاش یہاں اشتراکی نظام ہوتا جہاں بڑے غور وخوض کے بعد مفت دوائیں، خوراک اور ہوادار کمرے میسر ہوتے۔ کوئی تفریق نہ ہوتی۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے خدا؟ اس کا سر چکرا گیا اور وہ بڑے بڑے ڈگ بھرتا گھر کی جانب چل پڑا۔

اندھیرے میں اُسے موت کی کئی بھیانک شکلیں نظر آنے لگیں۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ آنکھیں بند کر لے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اور سہمتا سہماتا چلتا رہا۔ اُسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب نیلم نہیں بچے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اُسے موت کے چنگل سے نہیں بچا سکتی۔ اور وہ بچ بھی کیسے سکتی ہے جب کہ اُس کا اچھی طرح علاج بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اُن کے پاس تھوڑا بہت جو روپیہ تھا وہ انہوں نے اس کی بیماری پر خرچ کر دیا تھا

اور قرض بھی لیا تھا مگر اتنے سے کیا ہو سکتا تھا؟ علاج نامکمل رہا اور نیلم..........

اُس نے بڑی خوفزدہ نگاہوں سے پردے کے سوراخوں سے اندر کی جانب جھانکا جیسے کوئی روٹھا ہوا بچہ جب گھر آتا ہے تو ڈرتے ڈرتے اپنے بزرگوں کو پردے کے پیچھے سے دیکھتا ہے۔ اور پھر آہستہ سے اُس نے پردہ اُٹھایا اور پھر..........

اور پھر......اور پھر جیسے گھر میں آئے ہوئے تمام اعزا و اقارب چلا اُٹھے۔ ''آوارہ گرد......آوارہ گرد'' مگر وہ ایسا نہیں چلائے بلکہ اُس کے ابا نیلم کے بے جان جسم پر گر کر دہاڑیں مارنے لگے۔ اندر کمرے میں بیٹھی ہوئی امی اور دوسری عورتیں بھی ''ہائے نیلم۔ہائے نیلم'' کہہ کر سر پیٹنے لگیں اور اُسے ایسا جان پڑا جیسے وہ سب نیلم کو نہیں اُس کی بیکاری......اُس کی غربت......اُس کی آوارہ گردی کو رو رہے ہیں اور چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔......آوارہ گرد......آوارہ گرد''..........

☆☆☆☆☆

انتم پروچن

(آخری وعظ)

بجنو!۔ یہاں موجود خواتین وحضرات! آج ہم سب لوگ جگل کشور جی کی وفات پر انہیں شردھانجلی ارپن کرنے کے لئے یہاں حاضر ہوئے ہیں مگر آج اس سٹیج سے مَیں بڑے دُکھ کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اس آسن سے یہ میرا آخری پروچن ہوگا اور اس کے بعد مَیں کبھی کسی کی مرتیو پر شردھانجلی کے لئے جمع ہوئے افراد کے سامنے اس آسن پر بیٹھ کر شردھانجلی ارپت کرنے اور ''گروڑ پران'' کی کتھا سنانے کی غرض سے نہیں آؤں گا۔ کیونکہ مَیں جب بھی اس اسٹیج پر بچھے اس آسن پر بیٹھتا تھا اور کسی شخص کی موت پر اُس کے بارے میں ویاکھیان دیتا تھا تو مَیں اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر موت کی آغوش میں سو جانے ولے شخص اور اُس کے پریوار کے بارے میں جو کچھ بھی بتاتا تھا اُس میں زیادہ تر جھوٹ ہوتا تھا کیونکہ اکثر لوگوں کے بارے میں تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو اس کے پریوار والے جو کچھ بھی لکھ کر دے دیتے تھے، اُسے ہی بنیاد بنا کر مَیں اُن کے بارے میں بولتا رہتا تھا اور مرحوم سے اُن کے پیار سنہیہ کی باتیں اور اُن کی سیوا بھاؤ کے فرضی قصے بیان کرتا رہتا تھا جو زیادہ تر جھوٹ ہوتے تھے جنہیں مَیں سچ کہہ کر پیش کرتا تھا مگر وہ پورا سچ نہیں ہوتا تھا بلکہ آدھا سچ ہوتا تھا۔

"میں ہی نہیں اس دنیا کے بھی افراد "آدھا سچ" ہی بولتے رہے ہیں اور بولتے رہیں گے۔ انسان نے پورا سچ کبھی نہیں بولا۔ وہ اتنا ہی سچ بولتا ہے جو اُس کے مفادات کے مطابق ہو اور جو حقیقت میں سچ نہیں بلکہ "آدھا سچ" ہوتا ہے۔ والدین، بزرگ، پیر، فقیر، مہاتما بھی سچ کے نام پر آدھا سچ بولتے ہیں۔ جب دو فریقین میں کسی بات پر تنازع ہوتا ہے تو دونوں اپنا اپنا پکھش ...... اپنا اپنا موقف سچ کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ تو اُن میں سے کون سچ بول رہا ہے؟ اُن میں سے کون سچا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ دونوں اپنے اپنے پکھش کو سچ کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ میں بھی قومیں اپنا پکھش پیش کرنے کے لئے جو سچ بولتی ہیں وہ آدھا سچ ہوتا ہے۔

لیکن آج میں جس شخص کی موت کے موقع پر بولنے لگا ہوں۔ اُسے میں اچھی طرح سے جانتا تھا اس لئے میں کوشش کروں گا کہ جہاں تک اُن کے بارے میں مجھے علم ہے، سچ کہوں اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جب میں سچ کہوں گا تو بھی لوگ مجھ سے ناراض اور غصہ ہو جائیں گے کیونکہ سچائی کا سامنا کرنے کی ہمت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے لہٰذا آئندہ بھی مجھے کسی کے سانحہ ارتحال کی آخری رسوم کے موقع پر ویاکھیان کرنے کے لئے نہیں بلائیں گے اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ اس کے بعد مجھے کوئی اس سلسلے میں مدعو کرنے کی جرأت کرے۔ کیونکہ مجھے اس طرح کے جھوٹ بولتے بولتے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی ہے اور اب ۸۰ رسال کی عمر میں جب میں خود بھی موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں، چاہتا ہوں کہ جھوٹ کو ترک کر کے جہاں تک ہو سکے سچائی کی راہ اپناؤں اور اپنی عاقبت سنواروں۔ اس لئے میں اپنی جانکاری کے مطابق جہاں تک ہو سکے گا سچائی بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

بجھو! یہ جو ہم مرنے والے کی مکتی یا موکھش کے لئے ''گروڑ پُران'' کی کتھا سناتے ہیں کیا آپ کو وشواس ہے کہ اس میں بیان کردہ باتیں سچ ہیں۔ مَیں نے تو دیکھا ہے کہ جب اس کا پاٹھ کیا جاتا ہے تو بعض لوگ اسے سُن کر ہنستے ہیں کہ کیا بیوقوفانہ باتیں بیان کی جارہی ہیں۔ سچ مانیے زیادہ تر پنڈتوں کو بھی ان پر وشواس نہیں لیکن اُن کی تو اس سے روزی روٹی وابستہ ہے اور وہ مرحوم کے گھر یا مندر جا کر اس کی مکتی کے لئے اس کا پاٹھ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس میں درج بعض باتیں حقیقت سے کوسوں دُور ہیں۔ تاہم ہم لوگ روایات کے مطابق مرنے والے کے موکھش کے لئے اس کا پاٹھ کرواتے ہیں اور اپنی تسلی کرتے ہیں۔ مگر یہ ''گروڑ پران'' کوئی مصدقہ کتاب نہیں۔ بازار میں بیسیوں ''گروڑ پُران'' کے نسخے ملتے ہیں اور ہر ایک میں پنڈتوں نے اپنی مرضی سے حذف و اضافہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے پاٹھ کا اصل مقصد انسان کو اُس موت سے جو برحق ہے، آگاہ کر کے نیک اعمال کا راستہ اپنانے اور دان پُن کرنے کی تلقین کرنا ہے۔

سورگیہ جگل کشور جی کو اس طرح کے آڈمبروں سے بڑی چڑ تھی۔ وہ ایک سناتن دھرمی پریوار میں پیدا ہوئے مگر وہ عام سناتن دھرمیوں کی طرح قدامت پسند نہیں تھے بلکہ وہ ایک ترقی پسند اور انسان دوست ہستی تھے۔ اُن کا دھرم مانو دھرم تھا۔ وہ ساری دنیا کو ایک برادری کی شکل میں دیکھتے تھے اور ساری دنیا میں امن اور شانتی کا قیام اُن کا خواب بھی تھا۔ اور آرزو بھی۔ اور انہیں انسان سے اتنا پیار تھا کہ وہ زندگی میں ہی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی اپنا جسدِ خاکی ضرورتمندوں کے تئیں وقف کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی وفات کے بعد کسی طرح کی مذہبی رسومات نہ کی

جائیں بلکہ اُن کے جسدِ خاکی کو طبی مقاصد اور ضرورت مند مریضوں کے لئے کسی ہسپتال یا طبی ادارے کو دان کر دیا جائے تاکہ وہ جسم کے کچھ حصوں جیسے آنکھوں گردوں، دل اور چمڑی وغیرہ کو ضرورت مند مریضوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے استعمال کر سکیں یا اپنی طبی تحقیق کے لئے رکھ لیں اور جسم کا باقی بچا کھچا حصہ جو کسی کام کا نہ ہو، اسے جس طرح بھی چاہیں، ٹھکانے لگا دیں۔ چاہے نذرِ آتش کریں...... سپردِ آب کریں یا...... زمین میں دفنائیں۔

مَیں جب بھی یہاں کسی کی وفات کی آخری رسوم میں پروچن کے لئے بلایا گیا ہوں۔ مَیں نے مرنے والے کی تعریف ہی کی ہے چاہے وہ عیبی اور بدقماش رہا ہو یا بے ایمان اور مکار۔ مَیں نے ہمیشہ کہا کہ وہ بڑے سجن پرش تھے اور اُن کی موت سے اُس کے سگے سمبندھیوں کو بڑا دکھ ہوا ہے۔ حالانکہ سچائی یہ تھی کہ اُس کی موت سے اکثر لوگ خوش ہوتے تھے کہ خس کم جہاں پاک۔ اس لئے وہ میری باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنستے تھے اور سرگوشیوں میں میرا مذاق بھی اُڑاتے تھے۔ یہی نہیں مَیں اُس کے لواحقین سے گہرے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی تعریف و توصیف کرتا تھا کہ انہوں نے مرحوم کی بے حد سیوا کی تھی حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر نے اُس کی رتی بھر سیوا نہیں کی تھی بلکہ اُس کی موت کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے اور بعض نے تو آخر میں تنگ آکر اُسے خود ہی موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

بچو! یہ ہم جس شخص کی آخری رسوم میں شامل ہونے کے لئے آئے ہیں، اُسے بھی درحقیقت اس طرح کے پنڈتوں کے جھوٹے پروچنوں سے سخت چڑ تھی۔ اگر اُس کا بس چلتا تو وہ اس طرح کی کوئی رسم بھی نہ ہونے دیتا۔ مگر کیا کیا جائے؟ مرنے

والا تو اب کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے اور وہ زندہ افراد کے بس میں ہے جو اسے اپنی مذہبی یا سماجی روایات کے مطابق ٹھکانے لگاتے ہیں۔ کوئی جلاتا ہے، کوئی دفناتا ہے اور کوئی سپردِ آب کرتا ہے۔

ورنہ جہاں تک جگل کشور جی کا تعلق ہے وہ موت کے بعد انجام دی جانے والے ایسی تمام رسموں کے مخالف تھے۔ اور اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ موت کے بعد ان کی لاش کو کسی طبی ادارے کے سپرد کر دیا جائے اور اس کے باقیات کو بڑی سادگی سے دستور کے مطابق ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کی موت سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی کوئی کام رُکتا ہے۔ وقت کا کاروان اپنی مقررہ رفتار سے چلتا رہتا ہے اور دنیا کا کاروبار بھی۔ یہ جو بیٹے آخری رسوم کے لئے اپنے اعزاء و اقارب کو جمع کر کے آخری رسوم ادا کرتے ہیں یہ زیادہ تر دکھاوا ہے۔

یہ جو ہمارے سامنے اس علاقے کے مشہور پراپرٹی ڈیلر انل کھنہ اور سریش کھنہ جی بیٹھے ہیں، ان کے والد اِن سے ہمیشہ ہی بڑے نالاں رہتے تھے اور انہوں نے انہیں کبھی گھر میں کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور ان کی بدتمیزیوں کی وجہ سے اپنے کمرے میں گھسنے تک کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مگر جوں ہی اُن کی وفات ہوئی، انل بخشی جی نے آتے ہی ماں سے کمرے کی چابی لی اور اندر جا کر ساری نقدی نکال لی۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے مردہ والد کی کلائی سے فوراً گھڑی بھی اُتار لی۔ اور پھر موت کے چند دنوں بعد ہی انہوں نے تمام جائیداد کا بٹوارہ کر لیا اور باپ کا مال عیش و عشرت میں اُڑانے لگے۔ یہی نہیں جب کچھ دنوں بعد ان کے ماتا جی بیمار ہو گئیں تو انہوں نے ان کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں کی۔ آخر مجبور ہو کر اُن کی بیٹی سنتوش انہیں اپنے گھر لے

گئی اور جب وہ آخری دم پہ تھیں اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی تو اُس نے انہیں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہسپتال میں داخل کرادیا۔ جب ان بھائیوں کو معلوم ہوا کہ ماں کا آخری وقت آگیا ہے تو وہ سماج کے طعنوں سے بچنے کے لئے اسے بہن کی مرضی کے خلاف زبردستی ہسپتال سے لے آئے اور یہاں اپنے گھر کے پاس ایک نرسنگ ہوم میں داخل کرادیا جہاں اُسی رات اُس کا انتقال ہوگیا۔ مگر وہ سب سے کہتے پھرتے تھے کہ ہماری بہن نے تو ہمارے ماتا جی کو سرکاری ہسپتال میں داخل کرادیا تھا مگر ہم نے انہیں نرسنگ ہوم میں رکھا مگر افسوس اُن کا انت آگیا تھا اور وہ سورگ سدھار گئیں۔ حالانکہ یہ ساری کہانی سبھی جانتے تھے کہ انہوں نے اُن کی کتنی سیوا کی ہے۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان کی آخری رسوم کے وقت میں نے بھی سچ بولنے کے بجائے یہی کہا تھا کہ ان بھائیوں نے ماتا جی کی بڑی سیوا کی تھی جو بالکل جھوٹ تھا ......صاف جھوٹ۔ انہوں نے تو اپنی ماتا جی کی وہ بے قدری کی تھی اور انہیں اتنا تنگ کیا تھا کہ وہ انہیں بددعائیں دیتی تھیں اور اُن کے مرنے کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان بچوں نے اپنی ماں کو کتنا تنگ کیا ہوگا کہ اُن کی بیٹی انہیں اپنے گھر لے گئی۔ ورنہ ہندو دھرم میں اعتقاد رکھنے والے بیٹی کے گھر رہنا اور کھانا پینا معیوب سمجھتے ہیں اور بیٹے کے گھر وفات پانا اور اُس کے ہاتھوں کریا کرم ہونا اپنے لئے ''موکش'' اور ''سورگ کی سیڑھی'' مانتے ہیں۔

اور یہ سامنے جو موٹی توند والے سندر داس اگروال بیٹھے ہیں جو ہمارے علاقے کے ایک مشہور سیاسی نیتا بھی ہیں۔ اِنہوں نے تو اپنے پتا جی کو جیتے جی ہی مار ڈالا تھا حالانکہ اِن کے جوان ہونے پر اِن کے پتا جی نے انہیں بڑے چاؤ سے اپنی

فرم کا کام سونپ دیا تھا کہ وہ اُن کے کاروبار کو بڑھا کر اُن کا نام روشن کریں مگر انہوں نے اپنی چاپلوسی اور فریب سے والد سے دستخط کرا کے جیتے جی اُن کی ساری جائیداد اور بزنس پر قبضہ کرلیا اور خود ہی کرتا دھرتا بن بیٹھے۔ مگر شاید اس پر بھی ان کی تسلی نہیں ہوئی، انہوں نے اپنے ماتا جی اور پتا جی کو اُن کے بڑے بیڈروم سے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں منتقل کر دیا اور اُن سے نوکروں سے بدتر سلوک کرتے رہے۔ مگر جب اُن کی موت ہوئی تو بہت شاندار جنازہ نکالا گیا۔ اور کریا والے دن میں نے ہی نہیں کئی جانے مانے مقامی نیتاؤں نے بھی اُن کی تعریف کی تھی کہ انہوں نے اپنے والدین کی بے انتہا سیوا کی تھی حالانکہ سیوا تو کجا انہوں نے انہیں ڈھنگ سے پانی تک نہیں پلایا تھا اور وہ دونوں تنگ و تاریک کوٹھری میں ان کے رحم و کرم پر لیٹے رہتے تھے اور جو کچھ بھی کھانے کو دیتے تھے۔ جی کڑا کر کے کھا لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ایک دن مَیں انہیں ملنے کے لئے گیا تو انہوں نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تھا۔ ''پنڈت جی ایسی اولاد سے تو لاولد ہونا اچھی بات ہے۔''

یہ سامنے جو بناؤ سنگھار کئے عورت بیٹھی ہے، نرملا بھارگو۔ اس نے اپنے سسر کے مرنے کے بعد اپنی ساس کو کتنا تنگ کیا تھا۔ ذرا اس کے محلے اور پاس پڑوس کے لوگوں سے پوچھئے۔ ایک بار تو اس نے اپنی ساس کو گرم چمٹے سے بُری طرح زخمی کر دیا تھا اور وہ کئی مہینے تک ان زخموں سے تڑپتی رہی تھی۔ اور ایک بار غصے میں اس نے اپنے دانتوں سے اپنی ساس کی انگلی ہی کاٹ لی تھی اور جب تک مکان کی رجسٹری اس کے خاوند کے نام نہیں ہوگئی، اس نے چین کا سانس نہیں لیا۔ اب ساس کس حال میں ہے ذرا اس سے ہی پوچھیے۔

مگر ایسا نہیں ہے کہ آج سبھی بچے ایسے ہی ہے جو ماں باپ کی مناسب سیوا نہیں کرتے ہیں اور اُن کے آخری دن بڑی کسمپرسی میں کٹتے ہیں البتہ اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے بزرگ ماں باپ کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ والدین کی سیوا کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ بہت کم شرون کمار کی طرح فرماں بردار بیٹے اپنے ماں باپ کی دل و جان سے سیوا کرتے ہیں۔ یہ سامنے سبھاش شرما جی ہمارے سامنے بیٹھے ہیں جن کا دوائیوں کا بزنس ہے۔ جب یہ کمسن ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں ماتا جی نے محنت مزدوری کر کے پالا تھا۔ مگر بڑے ہو کر انہوں نے بھی اپنے ماتا جی کی جی جان سے سیوا کی تھی اور اُن کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا دھرم جانا تھا۔ آخری دنوں میں اُن کی یادداشت چلی گئی تھی اور وہ بول و براز بھی بستر پر کر دیتی تھیں مگر انہوں نے اور ان کی بیوی سوشیلا نے ان کے بول و براز کو صاف کرتے ہوئے کبھی ناک بھوں نہیں چڑھایا تھا اور تن من سے اُن کی سیوا میں لگے رہتے تھے۔ شاید اُن کی دعاؤں کا ہی پھل ہے کہ آج یہ لاکھوں کے مالک ہیں اور ان کے کئی مکان ہیں۔

اس میں شک نہیں بوڑھے ماں اور بزرگ اجداد ہمیشہ ہی نوجوان سماج کے لئے ایک بوجھ ایک تکلیف دہ مخلوق رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کو اپنے نحیف و نزار، بیمار اور چلنے پھرنے سے لاچار اور معذور بزرگوں سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُن دنوں نہ تو کوئی حکیم وئید تھا نہ کوئی ڈاکٹر تو وہ اُن معذور اور بیمار ماں باپ یا دادی دادا کو جنگلوں میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے جہاں وہ شیر بھیڑیے اور دیگر درندوں کی خوراک بن جاتے تھے۔

مگر جوں جوں سماج ترقی یافتہ ہوتا گیا بزرگوں سے نجات پانے کے بہتر طریقے سوچے گئے۔شاید منو نے اسی لئے بوڑھے اور ناکارہ افراد سے باعزت طریقے سے نجات پانے کے لئے انسان کے لئے آخری ٹھکانے ''سنیاس آشرم'' کی بنیاد رکھی تھی تاکہ انسان کو بوڑھاپے میں ایک ''پناہ گاہ'' نصیب ہو جائے۔اور آج کے جدید دور میں یہ آشرم ترقی کرتے کرتے اولڈ ایج ہوم کی شکل اختیار کر گئے ہیں جہاں نوجوان اولاد اپنے بیمار، لاچار اور ناکارہ بوڑھوں سے نجات پانے کے لئے انہیں اپنی زندگی کے آخری دن گزارنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے یا وہ بے یارومددگار اور معذور ہونے کی صورت میں خود وہاں پہنچ جاتے ہیں۔

بچو! یوں تو بوڑھوں کی زندگی شروع ہی سے خراب رہی تھی مگر موجودہ دور میں سائنس کی ترقی اور جدید دَور کی بود و باش اور روحانی خیالات کے فقدان اور مادّیات کی جانب انسانی توجہ نے ان کی حالت بد سے بدتر بنادی ہے۔آج مشترکہ کنبے کا تصور ختم ہوتا جارہا ہے جو بوڑھے لوگوں کو تحفظ بخشتا تھا۔آج بوڑھوں کو اپنے بچوں سے الگ تھلگ تنہائی اور اکیلے پن کی اذیت برداشت کرنی پڑ رہی ہے۔ماں باپ اور اولاد کا رشتہ دھیرے دھیرے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے۔جائیداد اور روپے پیسے کے لالچ میں رشتوں کا احترام بھلا کر اُن کا خون کیا جارہا ہے۔کہیں بیٹے کے ہاتھوں ماں باپ کا قتل سننے میں آتا ہے تو کہیں بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے مَیں نے ٹی وی پر ایک خبر سنی اور دیکھی تھی کہ راجستھان میں ایک بوڑھے کی موت ہو جانے پر اُس کے تین بیٹوں نے اپنی ماں سے چھٹکارہ پانے کے لئے ''ستی'' کے نام پر اُسے زبردستی جلتی چتا میں پھینک دیا تھا۔کیا وہ ستی ہوئی تھی یا اُس

کے بیٹوں نے اپنی بوڑھی ماں کی سیوا کرنے کے بجائے اُسے زندہ جلا کر اُس سے نجات ...... مکتی حاصل کی تھی؟۔ بوڑھوں کا آخر کیا ہوگا۔ امیر تو کسی آرام دہ اور پُرسکون اولڈ ایج ہوم میں شفٹ ہونے لگیں گے۔ مگر غریب بوڑھے ماں باپ کا کیا ہوگا؟ کیا اُن سے اُن کی اولاد اپنی جان بچا کر اُنہیں کسمپرسی کی حالت میں مرنے پر مجبور کر دے گی؟ آخر ان بوڑھوں کا کیا ہوگا؟ کیا آج کے نوجوان کل بوڑھے نہیں ہوں گے؟ اور اگر کل اُن کے بچے اُن کے ساتھ ایسا سلوک کریں تو وہ کیسا محسوس کریں گے؟

یہی نہیں ابھی آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ ایک ستر اسی سال کی بوڑھی عورت کو جو بیماری کی وجہ سے اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی، اُس کے گھر والوں نے کہیں دور دراز سے لا کر اُسے دہلی میں بے خانماں برباد چھوڑ دیا تھا۔ شاید یہ سوچ کر کہ وہ اپنا اتا پتا بتانے سے قاصر ہے اور وہ اس سے چھٹکارہ پالیں گے۔ کیا ہم ابھی بھی اُسی ہزاروں سال پرانی جنگلی تہذیب میں رہ رہے ہیں جب بوڑھے ماں باپ اور دادا دادی کو بوڑھا اور بیمار اور لاچار ہو جانے پر اُن سے نجات پانے کے لئے جنگلوں میں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔

سورگیہ جگل کشور جی کو مَیں نے کبھی مندر آتے جاتے یا پوجا پاٹھ کرتے نہیں دیکھا مگر وہ غریبوں اور مفلسوں کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ وہ کوئی پچاس پچپن برس پہلے پنجاب کے کسی گاؤں سے روزی روٹی کی تلاش میں دہلی آئے تھے۔ اور یہاں آکر انہیں زندگی کے کئی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ انہیں طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں کے کئی جگہوں پر چھوٹے موٹے کام کیے اور آخر کار ایک آٹو

سپئیر پارٹس کی فرم میں ملازمت اختیار کر لی اور کئی برس تک جنوبی ہندوستان کے شہروں میں اُن کے نمائندے کی حیثیت سے جا کر اُن کے لئے لاکھوں کے آرڈر لاتے رہے۔ پھر کچھ مدت بعد انہوں نے اُس فرم سے علیحدگی اختیار کر کے خود اپنی آٹو سپئیر پارٹس بنانے کی فیکٹری قائم کر لی اور اس بزنس میں لاکھوں نہیں کروڑوں روپے کمائے اور بڑا نام کمایا۔

مگر یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ ان کے دو دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوتے ہوئے بھی انہیں آخری زندگی میں کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا حالانکہ انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت کے لئے اچھے اسکولوں اور کالجوں میں بھیجا تھا اور اعلےٰ تعلیم دلوانے کے بعد انہیں اپنے کام کاج میں شریک کر لیا۔ مگر آہستہ آہستہ بچوں نے بزنس پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا اور ایک دن انہیں بالکل ہی بے دخل کر کے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔ اب وہ اور اُن کی شریکِ حیات گھر کے ایک کونے میں پڑے رہتے۔ کوئی اُن کو پوچھنے والا نہیں تھا۔ شادی شدہ بیٹی تھی وہ کبھی کبھار ٹیلی فون پر اُن کا حال چال پوچھ لیتی یا کبھی اپنے شوہر کے ساتھ آ کر اُن کی مزاج پُرسی کر جاتی مگر بیٹوں کو بزنس سے فرصت نہ تھی اور بہوئیں کٹی پارٹیوں اور شاپنگ میں دن بھر مصروف رہتیں۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دن اُن کی بیوی کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ سورگ سدھار گئیں اور اب وہ بالکل تن تنہا رہ گئے۔ کوئی اُن کا پُرسان حال نہ تھا۔ وہ اپنی کوٹھی کے ایک الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے پڑے رہتے۔ اور انہیں کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ اس تکلیف دہ زندگی سے کیسے نجات پائیں۔

تبھی ایک دن اُن کے ایک بچپن کے دوست روشن لال گپتا آ گئے۔ جن کی نجف گڑھ علاقے میں ایک فیکٹری اور بہت بڑی کوٹھی تھی اور وہاں کے ایک جانے مانے بزنس مین اور بہت ہی سمجھ دار اور زمانہ ساز آدمی تھے۔ اُن سے اُن کی یہ قابلِ رحم حالت دیکھی نہ گئی اور انہوں نے انہیں رائے دی کہ وہ اپنے بچوں کا موہ چھوڑ دیں اور انہیں خیر باد کہہ کر آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے لئے کوئی قدم اُٹھائیں ۔اس پر جگل کشور جی نے کہا۔ ''مگر مَیں کیا کروں۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ ایسے میں مَیں آسائش و آرام کی زندگی بھلا کیسے گزار سکتا ہوں؟''

گپتا جی کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ اس کا علاج میرے پاس ہے ۔ اگر عمل کرو تو تمہارے سب دکھ دُور ہو جائیں۔ اور تمہاری بقیہ زندگی سکھ چین سے بھی گزرے گی۔''

''وہ کیسے؟ لالہ جگل کشور جی نے بڑے استفہارانہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ ایسے کہ اگر کبھی تمہارے پریوار والے ایک آدھ ہفتے کے لئے باہر جائیں تو اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر اس مکان کو جو کہ کم از کم دو کروڑ کا ہے فروخت کر کے کسی ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں وہ لوگ تمہیں تلاش بھی نہ کر پائیں۔''

جگل کشور جی کو کانپ اُٹھے۔ انہیں گپتا جی کی یہ اسکیم پسند نہیں آئی تھی۔ بھلا بچوں کے ساتھ فریب۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایسا کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس اسکیم پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر گپتا جی نے سمجھایا۔

''دیکھو جگل کشور! تمہارے بچوں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ تم نے بچوں پر اعتماد کر کے اُن کے نام اپنا کروڑوں کا بزنس کر دیا اور انہوں نے تمہارے

ساتھ کیا سلوک کیا؟ تمہیں آفس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا اور تم کچھ بھی نہ کر سکے۔ اگر یہ مکان بھی اُن کے نام ہوتا تو شاید تمہیں سڑکوں پر بھکاریوں کی طرح زندگی گزارنی پڑتی۔ جب بچوں نے تمہارے ساتھ دغا بازی اور فریب کیا ہے تو تم انہیں سبق سکھانے سے کیوں گھبراتے ہو۔ انہیں بھی ایک دھچکا دو تا کہ ماں باپ سے زیادتی کرنے والے کچھ بچوں کو نصیحت حاصل ہو۔

گپتا جی کے سمجھانے بجھانے پر جگل کشور جی اس اسکیم پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں کلکتہ میں اُن کے کسی قریبی رشتہ دار کی بیٹی کی شادی تھی اور وہ سبھی ایک ہفتے کے لئے وہاں چلے گئے۔ اُن کی غیر موجودگی میں گپتا جی نے اُس مکان کا پونے دو کروڑ میں سودا کرا دیا اور جگل کشور جی روپیہ لے کر گپتا جی کے کہنے کے مطابق کسی اور جگہ چلے گئے۔ جب ایک ہفتے بعد دونوں بیٹے لوٹے تو گیٹ اندر سے بند تھا اور اُن کے پتا جی کے کمرے کی بتی گل تھی۔ انہوں نے جب بہت آوازیں دیں۔ تو ایک آدمی نے بالکونی سے جھانک کر پوچھا۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘

’’جی ہمارے پتا جی کہاں ہیں؟‘‘

’’کون پتا جی؟

’’جی جگل کشور جی۔‘‘

’’دیکھئے ایسا ہے کہ وہ اپنا مکان بیچ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔‘‘

’’مکان بیچ کر چلے گئے ہیں؟‘‘ بیٹوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی۔

’’جی ہاں! اور آپ لوگوں کا سامان نیچے گیرج اور دو کمروں میں مقفل پڑا

ہے۔ صبح آ کر لے جایئے گا۔"

اور اس کے بعد وہ بچے کئی دن تک اپنے والد کو ڈھونڈتے رہے مگر اُن کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے ایک چھوٹا سا ڈیڑھ سو گز کا بنا بنایا مکان خرید لیا ہے اور کچھ روپیہ انہوں نے اپنی بیٹی کو دے دیا ہے کیونکہ اُسے اُن کی جائیداد سے کچھ نہیں ملا تھا۔

اس کے بعد بچے اُن سے معافی مانگتے رہے اور انہیں واپس گھر چلنے کے لئے اصرار کرتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے بچوں سے کہا بیٹا تم اپنی زندگی جیو اور میں اپنی۔ ہاں میں نے وصیت کر دی ہے تاکہ بعد ازاں کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ کیونکہ سارا جھگڑا زمین جائداد اور روپے پیسے کا ہی ہے۔

آخری عمر میں اُن کو کئی بیماریوں نے گھیر لیا۔ جب اُن کی حالت بہت خراب ہوگئی تو ان کی وصیت کے مطابق اُن کے دوست گپتا جی نے انہیں "سورگ آشرم" نامی اولڈ ایج ہوم میں داخل کرا دیا جہاں گیارہ دن پہلے اُن کی مرتیو ہوگئی تھی اور آج اُن کے بیٹوں نے ان کی آخری رسم کریا کے لئے آپ بجنوں کو اکٹھا کیا ہے حالانکہ جگل کشور جی نے اپنی آخری وصیت میں لکھا تھا کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کے کسی رشتہ دار کو نہ بلایا جائے اور اُن کے بیٹوں کے بجائے آشرم والے ہی اُن کی آخری رسوم ادا کریں۔ مگر بیٹوں کی بھی تو ناک کٹتی تھی اور انہیں سماج میں اپنی شان قائم رکھنی ہے۔ لہٰذا وہ اُن کا سنسکار کرنے کے لئے فوراً پہنچ گئے اور ساری رسومات اپنی حیثیت کے مطابق کرنے کے علاوہ انہوں نے مندروں اور پنڈتوں کو ہزاروں روپے دان بھی دیا ہے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جن ماں باپ کو لوگ ٹھیک

ڈھنگ سے کھانا نہیں کھلا سکتے۔ اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ ان کی موت پر وہ پنڈتوں کے بھوج پر ہزاروں روپے صرف کر ڈالتے ہیں اور مندروں، اور دیگر سماجی اداروں کو ہزاروں روپے دان دیتے ہیں۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کیا صرف سماج میں اپنی عزت اور شان کی خاطر۔ لیکن جگل کشور جی کا کہنا تھا کہ اولڈ ایج ہوم بوڑھوں کے مصائب کا حل نہیں۔ اور کوئی قانون بھی اس مسئلے کو پوری طرح سے حل نہیں کر سکتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس کا حل یہ ہے کہ لوگ اپنے بزرگ ماں باپ کو اپنے پاس رکھنا اور اُن کی سیوا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کل انہیں بھی بوڑھا ہونا ہے۔ انہیں بھی اسی صورت حال سے واسطہ پڑنا ہے۔ اگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی سیوا نہیں کریں گے، انہیں اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ سکھ اور آرام کی زندگی گزارنے سے محروم کر کے انہیں اذیت ناک تنہائی کے اندھیرے غاروں میں دھکیل دیں گے تو کل اُن کے بچے بھی جو دیکھیں گے وہی کریں گے۔ وہ بھی کل ان سے ایسا ہی سلوک کریں گے۔ اس لئے وہ بوڑھے ماں باپ کی سیوا کریں اور اُن کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھیں۔

سجنو! شاید آپ دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے..... کوس رہے ہوں گے اور میری باتوں سے ناخوش ہو رہے ہوں گے، اس لئے اس رسمِ پگڑی کے موقع پر اپنے پروچن ختم کرنے سے پہلے مَیں آپ لوگوں کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں جو شاید آپ کو حیرت میں ڈال دے کہ جگل کشور جی نے اپنے بچوں کے سلوک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی وصیت میں اپنا مکان اور کوئی ایک کروڑ روپے جو انہوں نے مکان بیچنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی کے لئے محفوظ رکھے تھے، ان بچوں کے بجائے اپنی

آخری پناہ گاہ ''سورگ آشرم'' کو دان دے دیے ہیں تا کہ آشرم والے مزید کمرے بنوا سکیں اور آخری عمر میں بے آسرا بوڑھوں کو اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے لئے ایک محفوظ اور آرام دہ ''پناہ گاہ'' فراہم کر سکیں۔

☆☆☆

ایک ''پاکستانی'' کی موت

چمن لال کو آج صبح ہی میرے سامنے چھاؤنی کے شمشان گھاٹ میں نذرِ آتش کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی مجھے ان کی موت کا یقین نہیں آتا اور بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اب بھی میرے سامنے کھڑے ہیں اور مجھ سے کچھ سوال پوچھ رہے ہیں جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

میں اُنہیں اپنے ذہن کے نہاں خانے سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ اُن کا چہرہ بائیسکوپ کی تصاویر کی طرح میرے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور وہ وہی اپنا پرانا فقرہ دوہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''بیٹے آپ نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ میری کہانی کب لکھو گے؟''

مَیں ان کے پر رعب سرخ و سفید چہرے، بڑی بڑی مونچھوں، قوی ہیکل شخصیت، ان کی یادوں، ان کی باتوں کو دل سے نکال دینا چاہتا ہوں مگر لاکھ چاہنے پر بھی اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور بار بار کانوں میں ان کا یہ فقرہ گونجنے لگتا ہے۔

''میری کہانی کب لکھو گے؟''

''میری کہانی کب لکھو گے؟''

ایسا نہیں کہ میں نے کبھی ان کی کہانی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کوشش تو کئی بار ان

کی زندگی میں بھی کی تھی کہ ان کی طویل جدو جہد سے بھری زندگی کو صفحۂ قرطاس پر ایک کہانی کی صورت میں بکھیر دوں مگر الفاظ نے کبھی بھی قلم کا ساتھ نہیں دیا اور میں ہزار چاہنے پر بھی ایسا نہیں کر پایا حتا کہ آج ان کے جسد خاکی کو آگ کی لپٹوں نے خاکستر کر کے ایک مشتِ غبار میں تبدیل کر دیا ہے اور اُن کی حسرت بھری کہانی ایسے انجام کو پہنچ گئی ہے جو ہر حساس شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور ذہن کو سوالات کے تانے بانے میں یوں اُلجھا کر رکھ دیتی ہے کہ انتہائی چاہنے پر بھی اس سے نجات نہیں مل پاتی۔

چمن لال کی کہانی کا خاتمہ تو اپنے آبائی گاؤں سے سینکڑوں میل دور دہلی کی اس بستی جنک پوری میں ہوا تھا جہاں وہ کئی برسوں سے اپنے بیٹے کے ساتھ رہ رہے تھے مگر آغاز مغربی پنجاب کے ضلع راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے گاؤں اراضی سے ہوا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر والدین نے انہیں گاؤں کے ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول میں داخل کرادیا لیکن اُن کا پڑھائی میں ذرا بھی جی نہیں لگتا تھا اور وہ سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیلنے میں مصروف رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بڑی مشکل سے مڈل تک پڑھ پائے۔ اُن کے والد کی خواہش انہیں ہائی اسکول تک پڑھانے کی تھی لیکن انہیں تو پڑھائی کے نام سے ہی بخار چڑھ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں والد کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ انہیں گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح کھیتی باڑی اور مویشی چرانے پر لگا دیں۔ کئی دن تک وہ اس مسئلے پر غور و خوض کرتے رہے اور آخر انہیں ڈھور ڈنگر چرانے پر لگا کر انہوں نے اپنے دل کو یوں تسلی دی کہ وہ گاؤں کا واحد لڑکا تو نہیں ہے جس کا پڑھائی میں جی نہ لگنے کی وجہ سے کھیتی باڑی کرنے اور گائے

بھینس چرانے پر مامور کیا جارہا ہے بلکہ اس کی طرح اکثر لڑکے پڑھائی سے پنڈ چھڑا کر اپنے کھیتوں پر کام کرتے تھے اور بہت کم ہی ہائی اسکول تک پڑھنے کے لئے قریبی قصبوں ساگری یا کلر جایا کرتے تھے۔

جب وہ صبح ناشتہ کر کے گھر سے گائیں بھینسیں لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہوتے تو اسی وقت چودھریوں کے گھروں کی جانب سے اُن کا بچپن کا ساتھی محمود، جس نے ان کی طرح پڑھائی ترک کر دی تھی، اپنے مویشیوں کو چرانے کے لئے گھر سے نکلتا۔ وہ اکثر راستے ہی میں مل جاتے اور پھر دونوں مل کر مویشیوں کو ہانکتے کچھ دوری پر واقع چراگاہ کی جانب لے جاتے جہاں پہنچ کر وہ انہیں چرنے کے لئے چھوڑ دیتے اور خود کسی سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر تاش یا چوسر کھیلتے رہتے حتا کہ شام کے سائے ڈھلنے لگتے اور وہ اپنے اپنے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے۔

عمر کے بڑھنے کے ساتھ ہی اُن کی دوستی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اتفاق یہ کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر جب وہ فوج میں بھرتی ہوئے تو اُن کی رجمنٹ بھی ایک ہی تھی اور وہ برما کے محاذ پر شانہ بشانہ لڑتے اور گولیوں اور بموں کی بوچھار کا سامنا کرتے رہے۔ وہاں بھی اُن کی دوستی پر فوجی رشک کرتے تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ دونوں ایک ساتھ فوج سے بھی سبکدوش ہو کر گھر آگئے اور کھیتی باڑی میں لگ گئے۔

لیکن......ابھی انہیں سبکدوش ہوئے تھوڑا ہی عرصہ بیتا تھا کہ ضلع کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ گردونواح کے بلوائیوں اور چند مقامی

باشندوں نے یہاں بھی فساد برپا کرنے کی بڑی کوشش کی مگر گاؤں کے چودھریوں نے وہاں کی ہندو آبادی پر آنچ تک نہ آنے دی۔ لیکن اس کے بعد سیاسی اور مذہبی حالات بنے ملک میں کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ برِ صغیر کے لاکھوں انسانوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر مجبوراً ہجرت کرنی پڑی اور ایک دن انہیں بھی وہاں سے نکال کر ہندوستان بھیجنے کے لئے ملٹری اور پولیس آ گئی اور وہاں آباد ہندوؤں کو جو زیادہ تر کسان تھے، گھروں سے نکال کر ٹرکوں میں بٹھانے لگے۔

چمن لال بھی اپنا وطن چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اُن کا جگری دوست چودھری محمود بھی انہیں جانے سے روک رہا تھا مگر اُن کی کسی نے نہیں سنی اور انہیں ڈرا دھمکا کر زبردستی ٹرک میں بٹھا دیا گیا۔ صرف وہی نہیں بلکہ ان کی طرح اور بھی کئی لوگ گھر چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ اُن کا ایک پڑوسی دیوان چند کسی قیمت پر بھی اپنا گاؤں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لیکن پولیس کے حوالدار نے اسے دو تین بید رسید کر کے زبردستی ٹرک میں سوار کرا دیا۔ چمن لال کا ایک چچا زاد بھائی مالک رام بھی جو گاؤں کے ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھا، اور وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا، بھاگ کر نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا کہ پولیس کے لاکھ ڈھونڈنے پر بھی نہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی بیوی اور بچے تو ٹرک میں ہندوستان بھیج دیئے گئے مگر وہ وہیں رہ گیا۔ بعد ازاں جب حالات نارمل ہو گئے تو وہ گاؤں واپس آ گیا اور گاؤں کے چھوٹے سے پرائیوٹ ہسپتال میں جس کا ڈاکٹر ہجرت کر کے ہندوستان چلا گیا تھا بحیثیت "ڈاکٹر" گرد و نواح کے بیماروں کا علاج معالجہ کرنے لگا اور لگ بھگ تیس برس بطور "ڈاکٹر" کام کرنے کے بعد وہیں اس کی موت ہو گئی اور وہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ہندوستان آکر چمن لال کو سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ ان کے خاندان کے افراد کو ضلع انبالہ کی تحصیل جگادھری میں زمین الاٹ کر دی گئی لیکن وہ زمین بھائیوں کے حوالے کر کے خود دہلی آ گئے جہاں پرائیویٹ بی۔اے کرنے کے بعد وہ سنٹرل سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئے اور کوئی تیس سال ملازمت کرنے کے بعد جنک پوری میں اپنے ذاتی مکان میں سبکدوشی کی پرسکون زندگی بسر کرنے لگے۔

چمن لال سے میری ملاقات بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ ایک دن ڈاکیہ میرا ایک خط غلطی سے اُن کے گھر پھینک گیا۔ جب انہیں ایڈریس سے معلوم ہوا کہ میں اُن سے صرف پانچ مکان کی دُوری پر ہی رہتا ہوں تو وہ خط پہنچانے خود میرے گھر آ گئے۔ ان کی اس مہربانی کے لئے میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولے۔ ''ارے اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، یہ تو میرا انسانی فرض تھا۔''

یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ مَیں نے انہیں آواز دی۔

''آیئے بیٹھئے نا...... ایک کپ چائے......''

''جی نہیں شکریہ۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔ میرے پوتے کے اسکول سے آنے کا وقت ہو گیا ہے مجھے بس اسٹاپ پہنچنا ہے۔''

''اچھا تو پھر کبھی تشریف لایئے گا۔''

''ضرور۔'' اُنہوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا اور بڑے بڑے ڈگ بھرتے بس اسٹاپ کی جانب چلے گئے۔

اس ملاقات کے بعد ہماری ملاقات کہیں نہ کہیں ہو جاتی۔ کبھی مارکیٹ میں سودا سلف خریدتے ہوئے، کبھی بس سٹاپ پر اور کبھی گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے اور پھر ہمارے

تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ کبھی وہ میرے گھر آجاتے اور کبھی میں اُن کے گھر چلا جاتا۔
میں سمجھتا ہوں کہ ہماری قربت اور اپنائیت میں اُردو زبان نے بھی ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ اگر یہ زبان ہم میں قدر مشترک نہ ہوتی تو شاید ہمارے تعلقات اتنے نہ بڑھتے۔ جب وہ پہلی بار میرے گھر آئے اور انہوں نے ہندو پاک کے اخبارات و رسائل دیکھے تو وہ بڑی للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتے رہے کیونکہ انہیں اُردو زبان سے والہانہ عشق تھا اور وہ اُردو کتب و رسائل بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔
جب وہ جانے لگے تو انہوں نے کچھ جھجکتے جھجکتے کہا۔ ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''ارے نہیں صاحب۔ آپ فرمایئے تو..........''

اس پر وہ بولے ۔''مجھے اُردو اخبار رسالے پڑھنے کا بڑا شوق ہے اگر آپ مہربانی کر کے کچھ ....''

''ہاں۔ہاں۔ کیوں نہیں۔ آپ جو لے جانا چاہیں، شوق سے لے جایئے۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ میں کتابیں اور رسائل عاریتاً دینے سے احتراز کرتا ہوں کیونکہ میرا تلخ تجربہ ہے کہ اکثر لوگ انہیں واپس نہیں کرتے۔ لیکن اُن کے کہنے کے انداز سے مَیں اتنا متاثر ہوا کہ انکار نہ کر سکا۔

اور پھر وہ اکثر میرے گھر آنے لگے۔ کبھی کوئی کتاب یا رسالہ لینے کے لئے اور کبھی واپس کرنے کے لئے اور ان ملاقاتوں میں مَیں اُن کے بارے میں بہت کچھ جان گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انہیں پاکستان کے اس علاقے سے بے حد پیار ہے جہاں وہ پیدا ہوئے اور کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے اور کئی بار تو اپنے وطن اور وہاں

کے حالات سناتے ہوئے اُن کی آنکھیں بھر آتی تھیں اور وہ بڑی حسرت ویاس سے کہتے۔ ''بیٹا! زندگی میں بس ایک ہی خواہش ہے کہ ایک بار کسی طرح اپنا وطن دیکھ آؤں۔''

تب میں اُن کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہتا۔ ''آپ مایوس نہ ہوں۔ وہ وقت جلد آئے گا جب آپ اپنی جنم بھومی کے درشن کر پائیں گے۔''

''شاید نہیں۔'' وہ مایوسی کے عالم میں کہتے اور اُٹھ کر اپنے گھر کی جانب چل پڑتے۔

۱۹۶۵ میں ہندو پاک جنگ کے دوران کا ذکر ہے کہ ایک دن علی الصباح بغیر نہائے دھوئے آگئے اور صوفے پر بیٹھتے ہی کہنے لگے۔ ''کل میری بیوی کو عجیب واقعہ پیش آیا۔ شکر ہے، بات زیادہ نہیں بڑھی۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''بس۔ کل وہ بے چاری مصیبت میں پھنستے پھنستے بچ گئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل بعض خود ساختہ والنٹیر اپنی حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے اور پاکستانی جاسوسوں کو پکڑنے کے نام پر سڑکوں اور گلیوں میں نکل آئے ہیں اور ہر اجنبی کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہی نہیں بلکہ کئی بے قصور افراد کو پاکستانی ایجنٹ سمجھ کر پٹائی کر دیتے یا تھانے پہنچا دیتے ہیں۔ اتفاق سے کل میری بیوی اپنی بھانجی سے ملنے بس سے تلک نگر گئی تھی۔ شلوار قمیض میں ملبوس اس سیدھی سادی عورت نے اس وقت ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا جس میں وہ اپنی بھانجی کے لئے فروٹ وغیرہ لے جا رہی تھی۔ قریب ہی بیٹھے ایک شخص نے اُس سے پوچھا۔ مائی تو کہاں سے آئی ہے؟ اس بیچاری نے سمجھا کہ وہ اس سے پوچھ رہے ہیں کہ اس کا تعلق کس علاقے سے ہے لہٰذا اس نے بڑی معصومیت

سے جواب دیا۔ ''پاکستان سے۔''

بس اتنا کہنا تھا کہ لوگوں نے اُسے گھیر لیا اور پاکستانی ایجنٹ سمجھ کر تھانے کی طرف لے جانے لگے لیکن اس اثنا میں اتفاق سے ہمارا ایک قریبی رشتہ دار وہاں پہنچ گیا جو علاقے کا جانا مانا شخص ہے۔ اُس نے ان خود ساختہ والنٹیر وں کو سمجھایا کہ انہیں سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے ورنہ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس علاقے سے ہجرت کر کے آئی ہیں جو اب پاکستان ہے۔''

چمن لال کو اپنی جنم بھومی پاکستان سے بڑا اُنس تھا اور وہ وہاں کی خبریں بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ زندگی میں ایک بار اپنا ''وطن'' دیکھ آئیں۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح انہیں ویزا مل جائے مگر انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان آنے والے ہر نئے پاکستانی سفیر کو درخواست بھیجی تھی۔ یہی نہیں وہ پاکستان کے صدور اور وزراء اعظم کو بھی خطوط لکھتے رہتے تھے۔ یہ خط و کتابت ایک بھاری بھرکم فائل میں تبدیل ہوگئی تھی مگر افسوس اُنہیں ہر جگہ سے مایوسی ہوئی تھی اور انہیں پاکستان جانا نصیب نہ ہوا۔

انہوں نے کئی بار مجھ سے اس بارے میں سوال کیا تھا اور اُن کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ''بیٹا مجھے پاکستان کا ویزا کیسے ملے گا......؟میں اپنا شہر اپنا وطن دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔'' مجھے اُن کی اس دیرینہ حسرت کے اظہار پر ترس آجاتا لیکن یہ مسئلہ صرف ایک انہیں کا مسئلہ تو نہیں تھا، برصغیر کے لاکھوں افراد کا تھا جو سرحد کے دونوں طرف مہاجر کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور جو سرحدی

قوانین اور پابندیوں نیز پولیس اور فوجی پہروں کے کارن اپنی جنم بھومی کے درشن کرنے اور اپنے دوستوں اور اپنے اعزاء واقارب کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ برصغیر کے اربابِ حکومت وسیاست جب کبھی کانفرنس یا اجتماع میں اکٹھے ہوتے ہیں تو دونوں ملکوں میں دوستی اور بھائی چارے کی باتیں کرتے ہیں لیکن اپنے ملک کے عوام میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت کی آگ بھی بڑھکاتے رہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ دونوں ممالک کے عوام آزادی سے ایک دوسرے کے ملک میں آجاسکیں۔

مرنے سے کچھ دن پہلے میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو وہ مایوسی کے عالم میں بولے۔ ''اب وطن دیکھنے کی کوئی امید نہیں رہی۔'' تب میری آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن انہیں بمشکل روک کر مَیں نے اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے تسلی دی اور کہا۔

''آپ مایوس نہ ہوں۔ آج ہی کی خبر ہے کہ دونوں ممالک کے وزراء اعظم جلد ہی ملنے والے ہیں اور وہ دونوں ممالک کے درمیان آمد و رفت کی سہولیات فراہم کرنے کے لئے کوئی مثبت قدم اٹھائیں گے اور آپ جلد ہی پنڈی جاسکیں گے۔''

لیکن گزشتہ نصف صدی کے تجربات نے انہیں احساس دلادیا تھا کہ سرحدی قوانین میں نرمی اور دونوں ممالک میں بلا روک ٹوک آمدورفت کی باتیں شاید ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں لہٰذا وہ میری بات سن کر بولے۔ ''یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ دونوں ممالک کے اربابِ حل وعقد نے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور نہ ہی مستقبل قریب میں کوئی ایسے آثار نظر آتے ہیں۔ اس لئے میں بھی ان ہزار ہا افراد کی طرح جو اپنی جنم بھومی...... اپنے مولد...... کو دیکھنے کی حسرت لئے اس دنیا سے کوچ کر گئے، ایک دن اسی تمنا...... اسی آرزو...... کو

دل میں لئے اس جہان فانی سے کوچ کر جاؤں گا۔"

اور آج............ جب اُن کے جسد خاکی کو نذر آتش کر کے ہم لوگ واپس گھر آئے ہیں تو بار بار ان کا یہ فقرہ میرے ذہن میں گونج جاتا ہے۔" بیٹے میری کہانی کیوں نہیں لکھتے؟ میری درد بھری کہانی بھی تو لکھو۔" اور میں چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اُن کی داستان غم قلمبند کروں۔ مگر کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ الفاظ قلم کا ساتھ نہیں دیتے حالانکہ میری دلی خواہش ہے کہ اُن کی کہانی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دوں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ وہ ایک ایسے ہندوستانی تھے جن کا جسم تو ہندوستان میں تھا مگر روح پاکستان میں۔

☆☆☆☆☆

خود نداتی

''سرلا میرا موبائل کہاں ہے؟'' مَیں نے بیوی کو زور سے آواز دیتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟ ابھی تو آپ کھنہ صاحب سے بات کر رہے تھے۔''

''ہاں کر تو رہا تھا مگر اب کہیں نظر نہیں آ رہا۔''

''دھیان سے ڈھونڈیئے کہیں ٹیبل پر یا کتابوں کے شیلف پر رکھ دیا ہوگا۔''

''نہیں وہاں نہیں ہے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے کہ کیلاش کا بیٹا راجو اُٹھا کر لے گیا ہوگا۔''

''راجو لے گیا ہوگا؟ کچھ سوچ سمجھ کر بولا کیجئے۔ آج تک یہاں سے ایک سوئی بھی نہیں ہلی اور وہ موبائل لے جائے گا؟'' بیوی کیلاش کے بیٹے راجو کا نام سُن کر غصہ سے چیخ اُٹھی جیسے مَیں نے بنا سوچے سمجھے راجو پر نہیں بلکہ اُس پر چوری کا الزام لگا دیا ہو۔ دراصل ہمارے گھر میں جھاڑو پونچھا لگانے والی کیلاش بہت غریب ہونے کے باوجود بہت ایماندار عورت تھی۔ اُس کا شوہر کچھ سال پہلے زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اچانک فوت ہو گیا تھا اور وہ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کی

پرورش و پرداخت کر رہی تھی ۔ وہ گزشتہ کئی سال سے ہمارے یہاں کام کر رہی تھی لیکن آج تک ایک تنکا بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا تھا۔ اور ناغے بھی بہت کم کرتی تھی۔ ہاں کبھی کبھار جب اُسے کوئی کام پڑ جاتا یا وہ بیمار پڑ جاتی تو اپنی بیٹی یا بیٹے راجو کو کام کرنے کے لئے بھیج دیتی مگر وہ لوگ اتنے بھروسے مند تھے کہ کبھی شکایت کا موقع نہ ملا۔ آج تک گھر سے کوئی شے گم تو کیا اِدھر سے اُدھر بھی نہیں ہوئی تھی ۔ ہاں وہ ضرورت پڑنے پر میری بیوی سے کسی شے کی فرمائش کر دیتی تھی اور کبھی کبھار حاجت پڑنے پر ہزار دو ہزار روپے اُدھار بھی لے لیتی تھی اور حسبِ وعدہ واپس بھی کر دیتی تھی ۔ اُس پر شک کرنا گویا اپنے آپ پر شک کرنا تھا۔ لیکن اگر موبائل اُس نے نہیں اُٹھایا تو کہاں گیا؟ اُس کے سوا اِس گھر میں کوئی آیا بھی نہیں تھا اور جب گھر میں نہیں مل رہا تو گیا کہاں؟ مَیں تو سبھی جگہ ڈھونڈ چکا تھا۔

مَیں موبائل کے گم ہونے سے بے حد پریشان تھا کیونکہ مَیں نے اسے ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی ساڑھے دس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اور جب انتہائی تلاش کرنے کے بعد نہیں ملا تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ بڑھیا کیمرے والا موبائل دیکھ کر اُس کی نیت خراب ہو گئی ہو گی اور وہ چپکے سے جیب میں ڈال کر رفو چکر ہو گیا ہے۔ مگر میری بیوی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

خیر جب ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام ہو گئی تو بیوی کو بھی فکر لاحق ہوئی اور وہ بھی اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگی۔ لیکن موبائل کہیں ہوتا تو ملتا نا۔ اس بیچ مَیں نے کئی بار دوسرے فون سے موبائل فون کا نمبر بھی ملایا کہ اگر گھر میں ہو تو پتہ چل جائے۔ کیونکہ اکثر جب وہ اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا تو میں دوسرے "لینڈ لائن فون" پر نمبر ملا کر پتہ لگا لیتا

تھا کہ وہ کہاں پر پڑا ہے۔ مگر آج کئی بار نمبر ملانے پر بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر بار گھنٹی بجنے کے بجائے اس پر Switch Off اور Out of reach کا میسج سنائی دیتا۔ اس پر میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ راجو ہی لے گیا ہے اور اُس نے سوِچ آف کر دیا ہے تاکہ ہم اس کا پتہ نہ لگا سکیں۔ جب بار بار موبائل کا نمبر ملانے پر گھنٹی سنائی دینے کے بجائے Switc off اور Out of reach کا ہی میسج سنائی دیا تو غصے سے مَیں آپے سے باہر ہو گیا اور بیوی پر چلا اُٹھا۔

"مَیں نے کتنی بار کہا تھا کہ گھر میں کام کرنے والوں پر زیادہ یقین مت کیا کرو اور اپنی چیزیں سنبھال کر رکھا کرو۔ مگر میری سنتا کون ہے؟"

"ارے مجھ پر بیکار کا کیوں چلا رہے ہو؟ کیا موبائل مَیں نے رکھا تھا؟ تم نے ہی فون کرنے کے بعد یوں ہی میز یا شیلف پر چھوڑ دیا ہوگا؟ اور پھر میرا موبائل سے کیا لینا دینا؟

بیوی کی بات سُن کر مَیں اپنی بات پر خود ہی شرمندہ ہو گیا کیونکہ اُس کا موبائل سے کیا واسطہ؟ وہ تو اسے کے خریدنے کے ہی خلاف تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ ہم ریٹائرڈ آدمی ہیں ہمیں نہ کہیں آنا نہ جانا۔ اور پھر ہمارا کون سا بزنس چل رہا ہے کہ فون پر لین دین کرنا ہے۔ اگر لینا ہی ہے تو کوئی سستا سا دو تین ہزار روپے کا موبائل خرید لو مگر مجھے تو کیمرے والا موبائیل ہی خریدنے کا شوق تھا۔ لہذا اُس کے منع کرنے کے باوجود مَیں اتنا قیمتی فون خرید لایا جو اُس کے نزدیک فضول خرچی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اُس نے تو اُسے اب تک چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر موبائل کو تو مَیں نے ہی لاپروائی سے رکھ دیا تھا۔ اس میں بیوی کیا قصور؟ مگر مَیں تو غصے میں تھا جو منہ میں آیا

بولتا رہا۔

رات بارہ بجے تک ہم نے ہر جگہ اُسے تلاش کیا۔ شیلف سے کتابیں اُتار کر شیلف کو بھی خالی کیا۔ بیڈ روم، رسوئی، ڈرائنگ روم کے تمام کونے کھدروں میں تلاش کیا مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اور بالآخر یہ سوچ کر دونوں سونے کی کوشش کرنے لگے کہ صبح کیلاش کے آنے پر اُسے اس کے بیٹے کی کرتوت بتائیں گے اور اُس کے بیٹے کو بلا کر موبائل نکلوانے کی کوشش کریں گے۔

ساری رات اِسی سوچ وچار میں گزر گئی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ پھر نہ جانے کب سویا مگر پھر علی الصباح ہی نیند کھل گئی اور میں کیلاش کا انتظار کرنے لگا۔ صبح حسبِ معمول جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوئی مَیں اپنے غصے کو روک نہ سکا اور بیوی کے صبر وتحمل سے کام لینے کی ہدایت کے باوجود اپنے غصے پر قابو نہ پا سکا اور اُس پر بپھر پڑا۔ "دیکھو کیلاش! کل تمہارا بیٹا میرا موبائل اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اُسے بلا کر کہو کہ وہ مجھے واپس کر دے۔"

"بابو جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا۔" جب میں اپنی بات پر اڑا رہا تو اُس نے راجو کو گھر سے بلوا لیا۔ جس نے بار بار قسمیں کھائیں اور کہا کہ اُس نے موبائیل نہیں چرایا۔ لہذا کوئی چارہ نہ دیکھ کر مَیں رپورٹ لکھوانے تھانے چلا گیا۔ جہاں انسپکٹر نے مجھ سے بڑے شائستہ انداز میں کہا۔ "صاحب ہمیں رپورٹ لکھنے میں کوئی اعتراض نہیں مگر ایسا نہ ہو کہ غریب مار ہو جائے۔ ذرا اپنے گھر میں اچھی طرح تلاش کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ گھر میں ہی کہیں رکھ کر بھول بھال گئے ہوں۔"

''جی نہیں ہم گھر کا کونہ کونہ چھان چکے ہیں۔ کہیں نہیں ملا''۔ مَیں نے تھانیدا کو بڑے وثوق سے کہا۔'' اور پھر گھر میں ہم دونوں میاں بیوی ہی ہیں۔ اور سوائے راجو کے اور کوئی آیا بھی نہیں۔''

تب انسپکٹر نے محرر کو بلا کر رپورٹ لکھنے اور ایک دوسرے سپاہی کو راجو کو تھانے میں بلانے کے لئے بھیج دیا۔ جو آدھ گھنٹے میں اپنی ماں کیلاش کے ساتھ تھانے آ گیا۔ تھانیدار نے اُسے دیکھتے ہی زور سے ڈپٹ کر کہا۔ ''اِدھر آؤ''

راجو اور اس کی ماں کیلاش ہاتھ جوڑ کر اُس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ انسپکٹر نے راجو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارا نام ہی راجو ہے؟''

''جی جناب'' راجو نے کہا

''بتاؤ وہ موبائل فون کہاں رکھا ہے؟''

''حضور مجھے کیا معلوم؟ مَیں نے تو دیکھا تک نہیں۔''

''دیکھا تک نہیں۔ مگر جب تمہارے سوا گھر میں کوئی اور آیا نہیں۔ تو کیا زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟''

''جناب مجھے کیا پتہ''

''تمہیں کیا پتہ؟'' انسپکٹر کو راجو کے جواب پر تاؤ آ گیا۔ اُس نے کرسی سے اچانک اُٹھ کر راجو کو دو تین تھپڑ رسید کر دئے۔ اس پر اس کے ساتھ ساتھ اُس کی ماں بھی رو رو کر التجا کرنے لگی۔ صاحب! بھگوان کی سوگند ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ صاحب! ہم غریب ضرور ہیں مگر چور نہیں۔'' مگر انسپکٹر کو بھی پورا یقین تھا کہ موبائل اسی لڑکے نے ہی چرا کر کہیں بیچ دیا ہوگا کیونکہ اسے اکثر ایسے لڑکوں سے واسطہ پڑتا رہتا

تھا۔ جب وہ مار پیٹ پر بھی نہ مانا تو اُس نے مزید انکوائری کے لئے اُسے حوالات میں بند کر دیا اور مجھے گھر جانے کی تاکید کی۔

مَیں بھی دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ تھانیدار کے کہنے پر فوراً گھر کی جانب چل پڑا۔ مگر مجھے دور تک کیلاش اور اس کے بیٹے کے رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ "صاحب! ہم غریب ضرور ہیں مگر چور نہیں۔"

گھر آنے پر بیوی کو بھی اُداس پایا۔ اُسے موبائل کے گم ہونے سے زیادہ کیلاش کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا افسوس تھا۔ وہ گھر کا سارا کام کاج بڑے سلیقے سے کیا کرتی تھی اور گھر کے ایک فرد کی طرح تھی۔ ایک تو اُس کے جانے کا افسوس اور پھر کئی مہینے تک کوئی کام کاج کرنے والی عورت بھی دستیاب نہ ہوئی۔ جسے کہتے وہی منع کر دیتی۔ کوئی تین چار مہینے بعد بڑی منت سماجت کر کے ایک بوڑھی عورت کو پہلے سے ڈیوڑھے پیسے دے کر کام کرنے پر راضی کیا۔ مگر نہ تو اُس میں کام کا سلیقہ تھا اور نہ چستی۔ بس کسی نہ کسی طرح گھر کا کام کاج چلنے لگا...... اور کیلاش سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناتا ٹوٹ گیا۔

اس واقعہ کے کوئی تین چار سال بعد بوجوہ ہمیں اپنا مکان بدلنا پڑا۔ سوچا کچھ پرانا اور ٹوٹا پھوٹا اور بیکار سامان کباڑیے کو بیچ دیں اور جو مرمت کر کے کام میں لایا جا سکتا ہو اسے مرمت کرا لیا جائے۔ ہمارے پاس بہت پرانا بیوی کے جہیز میں آیا ایک صوفہ بھی تھا جو کئی دہوں سے استعمال کرنے کی وجہ سے بڑی خستہ حالت میں تھا۔ سوچا اسے بھی کباڑیے کو دے دیا جائے مگر وہ ایک سو روپے سے زیادہ دینے کو تیار نہ تھا اور

پھر اُس کے ساتھ بیوی کی بھی جذباتی وابستگی تھی لہذا سوچا کہ کیوں نہ اس کی مرمت کرا کر اس کا ریکسین بدلوالیا جائے جس سے دو ڈھائی ہزار میں صوفہ نیا ہو جائے۔ وگرنہ نیا لینے کی صورت میں تو چھ سات ہزار روپیہ لگ جائے گا۔ یہ سوچ کر اُسے مرمت کے لئے رکھ لیا گیا اور دوسرے دِن صوفے کا سامان خرید کر ایک کاریگر کو بلوالیا کہ وہ صوفہ نئے سرے سے بنا دے۔

کاریگر نے کچھ لمحے صوفے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اُس کی پرانی ریکسین اُکھاڑنے میں منہمک ہو گیا اور مَیں اُس کے پاس ہی کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں اُس نے صوفے میں چوہوں کو گھسنے سے بچانے کے لئے اُس کے نیچے لگی جالی کو اُکھاڑا تو اُس کے اندر سے وہی موبائل دھڑام سے زمین پر گر پڑا جس کے بارے میں مجھے شک ہی نہیں، پورا یقین تھا کہ وہ راجو ہی نہیں چرایا تھا۔ اُس موبائل کو ہاتھ میں لیتے ہی میں خود ندامتی کے احساس سے زمین میں گڑ گیا اور مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی کہ کیوں مَیں نے ایک غریب آدمی پر شک کر کے اُس پر جھوٹا الزام لگایا اور اُسے ذلیل و خوار کر کے اُسے بے حد اذیت پہنچائی۔ اس احساس ندامت کی شدت نے مجھے اپنے شکنجے میں یوں جکڑ لیا کہ آج ایک مدت بیت جانے پر بھی میں اس سے چھٹکارہ نہیں پا سکا اور اب بھی میرے کانوں میں راجو کی ماں کیلاش کے یہ الفاظ گونجتے رہتے ہیں۔

''صاحب! ہم غریب ضرور ہیں پر چور نہیں......ہم چور نہیں''

☆☆☆☆
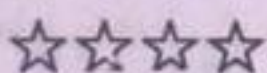
رشتے کا نام

''دادا جی! یہ ہے میری فرینڈ ڈورتھی''

''ہیلو'' یہ کہہ کر میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اور پھر جب وہ دونوں باہر چلے گئے تو میں یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا کہ کتنی گرل فرینڈز ہیں میرے پوتے سنجیو کی؟ کیونکہ وہ جب بھی واشنگٹن سے گھر آتا ہے تو اُس کے ساتھ ایک نئی گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ وہ کچھ ہفتے یا مہینے ایک گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا ہے اور پھر اُس کی جگہ کوئی اور لڑکی لے لیتی ہے۔

میری عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی ہے اور میں ہر دوسرے تیسرے سال اپنے بیٹے ستیش سے ملنے امریکہ آجاتا ہوں جو کوئی تیس سال پہلے دہلی سے نقلِ مکانی کر کے امریکہ آگیا تھا۔ تب اُس کا خیال تھا کہ وہ کچھ روپیہ کما کر واپس انڈیا آجائے گا مگر وہ یہاں پیسے کے چکر میں ایسا پھنسا کہ پھر اُسے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ اور اُس مغربی تہذیب میں پرورش و پرداخت پائے اُس کے بچوں سے تو اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ وہ تو وہاں کے تہذیب و تمدن میں ایسے گھل مل گئے تھے کہ انڈیا انہیں ایک ایسا غیر ملک معلوم ہوتا تھا جہاں غریبی، بھوک ننگ، غلاظت اور کرپشن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہاں جب میری رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا تو اُس نے مجھ سے

استدعا کی کہ اب میں بھی مستقل طور پر اُس کے پاس امریکہ آجاؤں مگر مجھے اپنی دہلی اور وہاں بنے اپنے مکان سے جانے کیسا اُنس تھا کہ اُس کی انتہائی خواہش کے باوجود مَیں اُس جگہ کو خیر باد نہیں کہہ سکا۔ ہاں دوسرے تیسرے سال دو چار مہینوں کے لئے وہاں آجایا کرتا تھا اور کچھ مدت بچوں کے ساتھ رہ کر پھر واپس انڈیا چلا جاتا۔

اپنے بیٹے اور اُس کے بچوں کی زندگی اور رشتوں کے بارے میں سوچ سوچ کر کبھی کبھی مَیں تذبذب میں پڑ جاتا۔ مغربی تہذیب نے رشتوں کے معانی ہی بدل دئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں کاروباری عنصر شامل ہوتا جا رہا ہے۔ مطلب کے بغیر نہ تو کوئی رشتہ ہے اور نہ رشتہ دار۔ دنیا میں جوں جوں سائنس کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، توں توں روحانیت ناپید ہوتی جا رہی ہے اور اُس کی جگہ مادیت لے رہی ہے اور یہی حال رہا تو وہ دن دُور نہیں جب رشتوں کی چادر سکڑ کر چند قریبی رشتوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گی۔ حالانکہ رشتوں کے ان گنت نام ہیں خون کا رشتہ...... دوستی کا رشتہ...... پڑوس کا رشتہ...... پیار کا رشتہ...... اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن اب ان رشتوں کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور رشتے کنبے کے چند افراد تک محدود ہوتے جا رہے ہیں۔

جب بھی مَیں ان آج کے رشتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو تخیل کے پردے پر "کرماں والی" کی تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور مَیں سوچنے لگتا ہوں آخر میرا اور کرماں والی کا کیا رشتہ تھا،؟ وہ میری کیا لگتی تھی؟۔ مَیں اُس سے اپنے رشتے کو کیا نام دوں؟، اُسے کس نام سے پکاروں؟ مَیں آج تک سمجھ نہیں پایا۔

کرماں والی سے اپنے رشتے کی بات سوچتے سوچتے ایک ٹھنڈی آہ نکل

جاتی ہے اور مَیں سوچنے لگتا ہوں۔ آہ طائرِ وقت پرواز کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اور اب تو اُس کی یادوں کے سائے بھی دھندلے ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہونے کے قریب ہیں۔ کیوں نہ ہو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہے اور اپنی زندگی کی شکستہ و بوسیدہ کشتی بھی نہ جانے کب موت کے طوفان کا شکار ہو جائے۔

کرماں والی کا خیال آتے ہی تنہائی کے اُن لمحوں میں کئی یادیں میرے ذہن و شعور پر گھنگھور گھٹاؤں کی طرح چھانے لگتی ہیں اور مَیں پروازِ تخیل سے بوڑھاپے سے واپس اپنے لڑکپن کے زمانے میں پہنچ جاتا ہوں اور مجھے گاؤں کا وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے جب مَیں پندرہ سولہ سال کے لڑکا تھا اور کرماں والی کی ایک جھلک پانے کے لئے گھنٹوں چھت پر کھڑا سودائیوں کی طرح اُس کا انتظار کیا کرتا تھا کہ شاید وہ کبھی کپڑے سکھانے کے لئے اُوپر چھت پر آ جائے اور اس کی ایک جھلک دیکھ لوں...... یہی نہیں روزانہ شام ہوتے ہی مَیں بازار کے کونے میں واقع کنوئیں کے سامنے ترلوک کی دکان پر جا کر بیٹھ جاتا کہ شاید وہ پانی بھرنے آ جائے اور مَیں اس کے شربتِ دیدار سے اپنی تشنگی بجھا سکوں لیکن افسوس اکثر اس کام میں مجھے عموماً مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑتا کیونکہ کبھی تو اُس کی چھوٹی بہن چھت پر کپڑے سکھانے یا کنوئیں پر پانی بھرنے آ جاتی یا پھر کسی کارن وہ کسی روز ناغہ کر لیتی۔

لیکن کیا اُسے میری اس دیوانگی کا علم تھا؟ نہیں...... شاید نہیں۔۔ اُس نے تو کبھی مجھے اس نگاہ سے دیکھا بھی نہ تھا اور شاید اُس کے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میرا دل اس کی قربت کے لئے ...... اُس کے دیدار کے لئے ...... ہر وقت ماہی بے آب کی

طرح تڑپتا رہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُس نے تو کبھی خواب میں بھی سوچا نہ تھا کہ میرے دل ودماغ میں کیا چل رہا ہے کیونکہ ایک تو مَیں عمر میں اُس سے بہت چھوٹا تھا اور پھر اُس کے چھوٹے بھائی کا دوست۔

کرماں والی کا اصل نام تیجندر کور تھا لیکن چونکہ وہ تین بہنوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اور اُس کا کوئی بھائی نہیں تھا لہٰذا یہ سوچ کر کہ اُس کے بعد اُس کا بھائی پیدا ہو گھر والوں نے اُس کا گھریلو نام کرماں والی رکھ دیا۔ لیکن کرماں والی نام رکھنے کے باوجود بھی اگلی بار اُس کی بہن پیدا ہو گئی اور بالآخر پانچ بہنوں کے بعد خدا خدا کرکے اُس کا بھائی اوتار پیدا ہوا جو اسکول میں مجھ سے دو سال پیچھے تھا۔

نہ جانے کرماں والی مجھے کیوں بہت اچھی لگتی تھی۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہے۔ حالانکہ میرا اور کرماں والی کا کوئی میل نہیں تھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کی تھی اور مَیں صرف پندرہ سولہ سال کا۔ وہ ایک اچھی صحت مند خوبصورت دوشیزہ تھی اور میں ایک دبلا پتلا سا لڑکا جو اپنی عمر سے بھی کم کا ہی نظر آتا تھا۔ اس لئے معاملہ یک طرفہ تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کرماں والی نے تو میرے بارے میں کبھی خواب میں بھی کچھ نہ سوچا تھا مگر مَیں تھا کہ اسی کے خیالوں میں ہی مستغرق رہتا تھا۔ اُس لڑکپن کے زمانے میں مجھے بس دو ہی چیزوں کا شوق تھا۔ کتابوں کا مطالعہ اور کرماں والی کے کتابی چہرے کی جانب ہر وقت دیکھنے کا دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا شوق۔

سچ تو یہ تھا کہ کرماں والی نے کبھی بھولے سے بھی میرے بارے میں کچھ نہ سوچا تھا لیکن میری حالت یہ تھی کہ مجھے اُس کی ہر سرگرمی کا علم رہتا تھا۔ وہ صبح اُٹھ کر

کس وقت اور کون سی جگہ رفع حاجت کے لئے جاتی ہے۔ اُس کا گوردوارے جانے کا وقت کیا ہے؟ شام وہ کب پانی بھرنے کنوئیں پر آتی ہے۔؟ اُس کی کون کون سی سہیلیاں ہیں اور وہ رات کتنے بجے سوتی ہے؟

اور صرف اُس کے قریب آنے کے لئے ہی مَیں نے اُس کے بھائی اوتار سے دوستی گانٹھ رکھی تھی حالانکہ وہ مجھ سے دو جماعت پیچھے تھا اور وہ بہت کم کسی کے ساتھ گھلتا ملتا تھا۔ وہ نہ تو کسی کے گھر آتا جاتا تھا اور نہ کسی کو اپنے گھر بلاتا تھا۔ وہ ہر وقت پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ اسی لئے لڑکے اسے "پڑھاکو" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے باپ کا اُس پر بڑا رعب تھا اور وہ اُسے دوسروں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے اور اِدھر اُدھر جانے سے منع کرتا تھا کہ کہیں وہ کسی بُری صحبت میں پڑ کر بگڑ نہ جائے۔

ورنیکولر فائنل پاس کرنے کے بعد چونکہ گاؤں میں ہائی اسکول نہیں تھا اس لئے مجھے سات آٹھ میل دور شہر جا کر قیام کرنا پڑا لیکن وہاں بھی میرا دھیان اُسی میں ہی لگا رہتا۔ جانے اُس میں کیا کشش...... کیا جاذبیت تھی کہ سنیچر کو چھٹی ہوتے ہی مَیں گاؤں کی جانب چل پڑتا اور کوشش کرتا کہ شام کو اُس کے کنوئیں پر پانی بھرنے کے لئے آنے سے پیشتر ہی وہاں پہنچ جاؤں اور اُس کے دیدار سے اپنی پیاسی آنکھوں کی تشنگی بجھا سکیں۔ لیکن اتنا سفر کر کے آنے کے باوجود بھی اکثر مجھے مایوسی کا ہی منہ دیکھنا پڑتا کیونکہ کبھی تو وہ اُس دن پانی بھرنے ہی نہ آتی اور کبھی میرے پہنچنے سے پہلے ہی پانی بھر کر جا چکی ہوتی۔ لیکن پھر بھی لگ بھگ ہر ہفتے اُس کی ایک جھلک پانے کے لئے مَیں پیدل چل کر عالمِ دیوانگی میں گاؤں پہنچ جاتا۔

معلوم نہیں کرماں والی میں کیا کشش تھی کہ وہ مقناطیس کی طرح مجھے اپنی جانب کھینچ لیتی۔ اور ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ معلوم نہیں مجھے کیا بھوت سوار ہوا کہ رات کو دس بجے لیٹے لیٹے ایسی سنک سوار ہوئی کہ بستر سے اُٹھ کر باہر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پاس ہی کی چارپائی پر ماموں سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے یوں یک لخت بستر سے اُٹھتے ہوئے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

'کچھ نہیں ماموں! ذرا رفع حاجت کے لئے جا رہا ہوں''

''اچھا'' ماموں نے اتنا کہہ کر کروٹ بدلی اور سو گئے۔

چونکہ میرے دل میں چور تھا اس لئے کمرے سے نکل کر جانے سے پیشتر مَیں نے باہر سے چٹخنی لگا دی تاکہ کہیں ماموں اچانک اُٹھ کر میرے پیچھے پیچھے نہ آجائیں۔ اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اُس کے گھر کی جانب چل پڑا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کا بھائی گھر پر نہیں بلکہ اسکول میں ماسٹر جی اُسے اور دیگر لڑکوں کو ورنیکولر فائنل کے امتحان کی تیاری کرا رہے ہوں گے۔ اور گھر میں وہ اور اُس وادی ہی ہوں گے۔ اور وادی سے تو کوئی خطرے کی بات ہی نہیں تھی ایک تو اُسے آنکھوں سے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا اور دوسرے کانوں سے بھی وہ کم سنتی تھی۔

گلی میں داخل ہوتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گلی میں سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ تاریکی بھی ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ پھر بھی خوف و ہراس سے میرے دل کی بُری حالت تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اُس موسم سرما کی یخ بستہ رات کو بھی میرا پسینہ چھوٹ گیا تھا اور دل بڑی تیزی سے دھک دھک کر رہا

تھا۔ بار بار یہ خیال دل میں آرہا تھا کہ اگر اس وقت کسی نے دیکھ لیا تو؟ کہیں ایسا نہ ہو چور سمجھ کر کوئی میری پٹائی ہی کردے۔ یا اگر پہچان کر یہ پوچھ بیٹھے کہ اتنی رات گئے تم یہاں کیا کرنے آئے ہو تو مَیں کیا جواب دوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے مَیں اُس کے گھر کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کی درزوں سے مَیں نے جھانک کر اندر کمرے میں دیکھا۔ کمرے میں لیمپ کی مدھم مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اُس مدھم روشنی میں وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مَیں ایک لمحہ کے لئے دروازے کے قریب رُک گیا اور پھر دروازے پر کھٹکھٹانے کے لئے ہمت بٹورنے لگا۔ لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ اگر اُس نے چور سمجھ کر شور مچا دیا تو اُس کے پڑوسی باہر نکل کر میری پٹائی کردیں گے اور میرے ساتھ میرے گھر والوں کی بھی بڑی بدنامی ہوگی جن کی گاؤں میں بڑی عزت و توقیر ہے۔ لہٰذا یہ سوچ کر حوصلہ نہ پڑا کہ دروازہ کھٹکھٹاؤں اور پھر جلدی سے گلی سے باہر نکل آیا اور گھر جا کر بڑی آہستگی سے مَیں نے دروازے کی کنڈی کھولی اور دھیرے سے جا کر بستر میں گھس گیا تا کہ ماموں جاگ کر دیر لگانے کی وجہ نہ پوچھ بیٹھیں۔

اس واقعہ کے بعد جب کبھی مجھے اپنی اس حرکت کا خیال آتا تو اپنی بے وقوفی پر ہنسنے کے ساتھ ہی کپکپاہٹ بھی ہونے لگتی کہ اس دن کتنا بیوقوفانہ قدم اٹھایا تھا مَیں نے؟ اور یہ کہ اگر اُس دن پکڑا جاتا تو میری کیا دُرگت بنتی؟ مجھے چور سمجھا جاتا یا کوئی آوارہ اوباش لڑکا؟

پھر اچانک کسی وجہ سے کرماں والی کو گاؤں سے کچھ مہینوں کے لئے اپنے ننھیال جانا پڑ گیا اور اسی دوران علاقے میں فرقہ وارانہ فساد کی ایسی آگ بھڑکی کہ الاماں والحفیظ۔ فسادات نے سارے علاقے کو آگ کی لپٹوں میں گھیر لیا۔ آگ زنی

اور خونریزی میں بلوائیوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کرماں والی جس گاؤں میں اپنے عزیزوں کے ساتھ سکونت پذیر تھی، وہاں کوئی شور شرابہ نہ ہوا مگر چاروں طرف حالات تشویشناک تھے اس لئے اس سے پہلے کہ وہاں کوئی ہنگامہ ہوتا وہ لوگ رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے اپنے گاؤں کی جانب چل پڑے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہاں اُن کے بہت سے رشتہ دار ہیں اور ان کی اچھی خاصی آبادی بھی ہے اس لئے وہ جگہ محفوظ ہوگی لیکن وہاں پہنچ کر انہوں نے گاؤں کو شعلوں کی لپیٹ میں دیکھا جہاں جگہ جگہ لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنی جان بچانے کے لئے گاؤں سے باہر واقع کنویں کے پاس اینٹوں سے تعمیر کردہ ایک عارضی غسلخانے میں کئی گھنٹے چھپے رہے۔ تقسیم کے برسوں بعد ایک دن جب ہم دونوں اکیلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو اُس نے مجھے بتایا تھا۔

"جب ہم گاؤں میں پہنچے تو وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور کچھ کراہنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ہم کنوئیں کے پاس بنے غسلخانے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ آدھی رات کو جب بھوک نے بہت ستایا تو ہم کھانے کی تلاش میں آگ کی لپٹوں میں گھرے گاؤں میں داخل ہوئے مگر انتہائی کوشش کے باوجود کہیں کچھ کھانے کو نہ ملا۔ اور پھر جب ہم مایوس ہو کر گاؤں سے باہر نکل رہے تھے تو اچانک آپ کے ننھیال کے جلے ہوئے مکان میں اچار کا ایک مرتبان مل گیا، ہم سبھی نے اُس میں سے تھوڑا تھوڑا اچار کھایا اور کنوئیں کا پانی پی کر اپنے پیٹ کی آگ کو کچھ حد تک ٹھنڈا کیا۔

اُس کی داستان سن کر مجھے احساس ہوا کہ آدمی مصیبت میں کیا کیا کرنے کو مجبور ہو جاتا ہے۔

پھر تقسیم کی آندھی کچھ ایسی چلی کہ تمام شیرازۂ زندگی منتشر ہو گیا۔ لاکھوں لوگوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک نئے مسکن کی تلاش میں ہجرت کرنی پڑی۔ برسوں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا اتہ پتہ نہ چلا اور آہستہ آہستہ زندگی معمول پر آنے لگی۔ لوگ اپنے عزیزوں اور احباب کی تلاش میں لگ گئے اور میں...... میں اُس دَور میں بھی کرماں والی کو نہ بھلا سکا۔ سوچتا نہ جانے وہ کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی۔

مگر اتفاق سے چند برس بعد ایک دن وہ مجھے چاندنی چوک میں اپنے شوہر کے ساتھ مل گئی۔ وہ گورو تیغ بہادر کے شہیدی جلوس کو دیکھنے کے لئے اپنے شوہر کے ساتھ ایک دکان کے تھڑے پر کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے پاؤں خود بخود رُک گئے لیکن اُس سے بات کرنے کی ہمت تو مجھ میں تھی نہیں۔ میں کئی لمحے اُس سے بات کرنے کے لئے الفاظ سوچتا رہا اور پھر بڑی مشکل سے ہمت بٹور کر میں اُس کے نزدیک پہنچا اور جھجکتے جھجکتے اُس سے پوچھا، ''کیا آپ اوتار کی بہن کرماں والی ہیں؟''

''ہاں'' اُس نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر چند ثانیے مجھے غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''کیا تم سریندر ہو؟''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔

اس پر وہ اپنے شوہر سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''یہ سریندر ہے اوتار کا دوست۔ یہ گاؤں میں ہمارے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔''

اُس کے تعارف کے بعد میری بھی ہمت بڑھی، میں نے بات کو آگے

بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔ ''آج کل اوتار کہاں ہوتا ہے؟''

''اوتار یہاں سنٹرل سیکرٹیریٹ میں ملازم ہے۔ اور ہمارے ساتھ ہی سبزی منڈی میں رہتا ہے؟ اور پھر اس سے پہلے کہ مَیں اُس سے دوبارہ ملنے کے لئے اُس کا پتہ پوچھتا۔ کرماں والی نے خود ہی مجھے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ ''کبھی ایت وار کو آؤنا اوتار سے ملنے۔''

مجھے تو من کی مراد مل گئی۔ جس سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے مَیں برسوں سے ترس رہا تھا۔ آج اُس نے مجھے خود ہی گھر آنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ ابھی اُسی وقت اُس کے ساتھ اُس کے گھر چل پڑوں۔ مگر اپنی مسرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''ضرور''۔ اُس کے بعد مَیں کافی دیر کھڑا اُس سے باتیں کرتا اور جلوس دیکھنے میں منہمک رہا اور جب جلوس ختم ہو گیا تو مَیں اُن دونوں کو الوداع کہہ کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا، مگر اُس دن میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ وہ لڑکی جس سے مَیں بات کرنے کے لئے مدتوں سے ترس رہا تھا آج اچانک ملنے پر مجھ سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے برسوں کی آشنائی ہو اور مدتوں سے بچھڑے دو دوست ہوں۔ اور مَیں سارا راستہ اتوار کو اُس کے گھر جا کر اوتار سے ملنے کے بہانے اُس سے ملنے کے خواب دیکھتا رہا اور اُس رات معلوم نہیں ان ہی خیالوں میں گم مَیں کب تک جاگتا رہا اور کب مجھے نیند آ گئی؟

اس کے بعد سبزی منڈی اُس کے گھر جانا میرا معمول سا ہو گیا اور زیادہ تر مَیں دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سیدھا اُس کے گھر چلا جاتا کیونکہ تب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اُس کا شوہر گیان سنگھ بجلی کے دفتر میں ملازم تھا

اور وہ اکثر دیر سے ہی گھر آتا تھا اور عموماً اُس کی شام کی شفٹ ہوتی تھی اور وہ رات دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ اُس کا بھائی اوتار بھی شام دفتر سے چھٹی کرنے کے بعد کہیں ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا تھا اور وہ بھی دیر سے ہی گھر لوٹتا تھا اس لئے زیادہ تر وہ گھر میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً ہی چائے کے لئے کیتلی چولہے پر چڑھا دیتی اور چائے کے ساتھ بسکٹوں اور سموسوں سے میرا استقبال کرتی۔ یہی نہیں جب گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اوتار کا انتظار کرنے کے بعد مَیں اُٹھنے لگتا تو وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرنے کو کہتی اور اس سے پہلے کہ میں اُٹھوں وہ کیتلی میں دوبارہ چائے کا پانی رکھ دیتی۔ اور اس بیچ ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ گاؤں کے لڑکے اور لڑکیوں کی باتیں...... گاؤں کے تہواروں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا۔

مَیں اُس کے ہاں اکثر جاتا لیکن وہ صرف دو بار میرے ہاں آئی تھی۔ پہلی بار شاید میری شادی کے بعد میری بیوی کو دیکھنے اور دوسری بار میرے ہاں بیٹا ہونے پر مبارک باد دینے۔ اس کے علاوہ یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی ہمارے ہاں آئی ہو۔ لیکن مَیں مہینے دو مہینے بعد اُس کے گھر جاتا رہا اور گھنٹوں اس سے باتیں کرتا رہا۔

پھر اُس کے بھائی کی شادی ہوگئی اور چند ماہ بعد اُسے لودی روڈ پر سرکاری کوارٹر الاٹ ہوگیا اور وہ وہاں منتقل ہوگیا۔ اب سبزی منڈی والے گھر میں صرف وہ اور اُس کا شوہر ہی رہ گئے۔ تب بھی مَیں مہینے ڈیڑھ مہینے بعد اُس کے گھر حسبِ معمول جاتا اور وہاں گھنٹوں اُس کے ساتھ محوِ گفتگو رہتا۔

پھر ایک دن اچانک اُس کا شوہر ایک کار حادثے میں انتقال کر گیا اور اُس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ

تھا۔ بھائی اُس کا دھیان تو رکھتا تھا مگر ایک تو اُس کے گھر سے بہت دور تھا پھر وہ بھی اپنے پریوار میں اتنا اُلجھ گیا تھا کہ اب وہ چھ چھ مہینے اُس کی خبر نہیں لے پاتا تھا۔ مگر مَیں اُن دنوں بھی معمول کی طرح اُس کے گھر جاتا رہا۔ اور ہر بار مجھے احساس ہوتا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ جب بہت دنوں ہو جاتے تو وہ کہتی:

''آج پورے دو مہینے بعد آ رہے ہو۔ کیا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔

''نہیں تو''

''تو پھر؟''

''بس یوں ہی......''

ہم جب بھی ملتے گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتے۔ کئی بار سوچتا، اُسے اپنی دیوانگی...... اپنے جنون...... اپنے عشق کے بارے میں کچھ کہوں مگر کبھی ہمت نہ ہوئی۔ نہ اُس نے کبھی اس طرح کی کسی بات کا اظہار کیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی ''مجھے تم سے پیار ہے'' یا'' I love you '' ایسے الفاظ کا استعمال کیا نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود ہم یک دوسرے کے بہت ہی قریب تھے جیسے دو گہرے دوست ہوں اور ایک دوسرے کے سے ملنے کے بے چین رہتے ہوں۔

ہم جب بھی ملتے تو گھنٹوں باتیں کرنے کے باوجود نہ تھکتے۔ ہماری باتیں زیادہ تر ماضی کی واقعات، گاؤں کی تلخ و شیریں یادوں وہاں کے میلوں ٹھیلوں اور گھر کے افراد کے بارے میں ہوتی تھیں۔ ایک بار مَیں نے گاؤں کے اپنے ایک دوست جوگندر کا ذکر کیا اور اُسے بتایا کہ کچھ دن پہلے معلوم ہوا ہے کہ اُس کا انتقال ہو گیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ اُس کی موت پر وہ بھی افسوس کا اظہار کرے گی اور اُس کی

یادوں اور باتوں کو یاد کر کے ہم اپنے دکھ کو کم کریں گے، مگر اُس نے اپنا کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا اور چائے بنانے میں منہمک رہی۔ میں نے سوچا شاید اُس نے میری بات سُنی نہیں اس لئے میں نے دوبارہ اُس سے کہ۔ ''شاید آپ نے سُنا نہیں گاؤں میں میرا ایک دوست جوگندر تھا نا۔ اُس کی وفات ہو گئی ہے۔''

اس پر وہ چولہے پر سے چائے کی کیتلی اُتارتے ہوئے بڑی آہستگی سے بولی۔ 'نہیں میں نے سُن لیا تھا۔ مگر میں کیا کہوں۔ مجھے تو وہ لڑکا بالکل پسند نہیں تھا۔

''کیوں''

'اُس کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ اُس کا کیرکٹر اچھا نہیں تھا۔ وہ گاؤں کی لڑکیوں میں بڑا بدنام تھا۔ ایک بار اُس نے میرے ساتھ بھی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اُس کی پتا جی سے شکایت کر دی تھی اور انہوں نے اُس کی خوب پٹائی کی تھی۔

اس بات کا مجھے ذرا بھی علم نہیں تھا۔ اور نہ ہی جوگندر نے مجھے یہ بات بتائی تھی حالانکہ میں اُس کا ہمراز تھا اور اُس کے کئی معاشقوں سے واقف تھا۔

خیر کرماں والی کی بات سے مجھے اُس کے بارے میں مزید بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے کوئی اور بات چھیڑ دی۔

وقت ریت کی طرح مٹھی سے کھسکتا جا رہا تھا اور بڑھتی عمر نے سیاہ بالوں میں چاندی کے تاروں، چہرے پر اُبھرتی لکیروں، بوڑھاپے کی بیماریوں ضعف اور جسمانی دردوں کی صورت میں نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا۔ اور اس بات کا احساس مجھے اُس دن ہوا جب میرے پہنچنے پر اُسے بائیں گھٹنے میں جوڑوں کے درد کی وجہ

سے اُٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے پاس پڑی کرسی کا سہارا لے کر اُٹھی اور بازار سے کچھ لانے کی غرض سے اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی۔ مَیں نے آواز دی۔

"کہاں جا رہی ہیں؟

"میرے سوال دینے کے بجائے وہ "ابھی آتی ہوں" کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور پانچ سات منٹ بعد ہاتھ میں کوک کی بوتل لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ مَیں نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی؟

"ضرورت کیوں نہیں تھی؟ آپ اتنی چلچلاتی دھوپ میں اتنی دُور سے پسینے میں تربتر آرہے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ مَیں کچھ اور کہتا ٹھنڈے کوک کی بوتل اُس نے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اور مَیں بات کو مزید آگے بڑھانے کے بجائے کوک کی چسکیاں لینے لگا۔ اور سامنے بیٹھی کر ماں والی کے جسم کے جائزہ لینے لگا۔ اُس کے سڈول بازو کا ماس لٹکنے لگا تھا اور چہرے پر چند جھریاں دیکھ کر مجھے اُس کی بڑھتی عمر کے ساتھ اپنی بڑھتی عمر کا بھی پہلی بار احساس ہوا۔ اُس دن بھی مَیں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھا اُس سے بیتے دنوں کی یادوں کو دہراتا رہا مگر میرے دل و دماغ میں زندگی کی آخری منزل کے قریب ہونے کا احساس بار بار کچوکے لگا رہا تھا۔ اور اُس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ شمع، زندگی کی لو تھرتھرانے لگی ہے اور اب ہم دونوں کے جدا ہونے کا وقت قریب آرہا ہے۔ معلوم نہیں اب ہم میں سے کون پہلے اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے راہی ملک عدم ہو جائے۔؟

اُس ملاقات کے بعد مَیں جب بھی جاتا مجھے یہی احساس بُری طرح ستاتا۔ جانے کب ہم میں سے ایک رخصت ہو جائے۔ اور مَیں اُس کے گھر سے رخصت ہوتے دروازے کے پاس جا کر رُک جاتا۔ اُس کی نظروں میں مایوسی اور نا اُمیدی کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی جیسے چوتھے پہر کا دیا ہوا کے تھپیڑوں سے لڑتے لڑتے بجھنے کے قریب ہو۔

کسی نے سچ کہا ہے موت بڑی ظالم ہے وہ کسی کو نہیں بخشتی۔ راجہ ہو یا بھکاری، پیر ہوں یا پیغمبر اس سچائی کا سامنا سب کو کرنا پڑتا ہے۔ اور مَیں تو اُس واقعہ کے بعد بالکل تیار تھا۔

اُس کی موت سے چند مہینے پہلے ایک دن مَیں اُسے ملنے اُس کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ شدید بیمار ہو گئی تھی اور چونکہ وہ اکیلی تھی لہذا اُس کا بھتیجا اسے اپنے گھر روہنی لے گیا ہے۔ ایک تو عمر نے مجھ میں بھی ہمت نہ چھوڑی تھی کہ اتنی دور جا پاؤں اور پھر وہ بھی کسی دوسرے انجانے کے گھر میں۔ وہ کیا سوچے گا کہ مَیں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں؟ ہاں مجھے اُس کی طرف دھیان ضرور رہتا تھا اور مَیں نے دو تین بار اُس کے بھائی سے اُس کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اس کی قوتِ گویائی میں لکنت سی آ گئی ہے اور اُسے بات کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اُس نے مجھے روہنی کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر بھی دیا جہاں وہ اپنے دیور کے بیٹے کے ہاں مقیم تھی۔ ایک دن مَیں نے ہمت کر کے ٹیلی فون پر اُس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی زبان میں اتنی لکنت تھی کہ وہ صرف چند الفاظ ہی بول پائی جو مجھے اُس کی بھرائی ہوئی آواز میں کچھ سمجھ نہ آئے اور پھر اس کی سسکی کی آواز آئی اور اُس نے فون بند کر دیا۔

یہ میری اُس سے آخری ملاقات تھی ادھوری اور تشنگی بھری۔ اور وہ بھی فون پر ...... جس میں اُس کے کہے ہوئے الفاظ اتنے غیر واضح تھے کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آئے۔ کئی بار سوچا ہمت کر کے رونی چلا جاؤں مگر معلوم نہیں کیوں ہمت نہیں ہوئی۔

اور پھر ایک دوپہر اچانک ایک تعزیتی کارڈ موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ ۴ جون ۲۰۰۴ء کو طویل علالت کے بعد کرماں والی کی وفات ہوگئی ہے اور آئندہ اتوار کو رونی کے گوردوارے میں اس کی یاد میں آخری اکھنڈ پاٹھ ہے۔

کارڈ پڑھ کر ایک عجیب سا دھچکا لگا۔ ماضی کی کئی یادیں اُبھر کر سامنے آگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت ہی بیش قیمت شے گم ہوگئی ہو جس کا ملنا محال ہے۔ خیر اب تو آخری خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے جانا تو اخلاقی فرض تھا لہذا اپنے ماضی کی یادوں کے بوجھ اُٹھائے میں بھی وہاں پہنچا۔ اکھنڈ پاٹھ کے دوران بھی دل ودماغ میں کئی یادیں اُبھرتی رہیں اور ماضی کے کئی واقعات بائیسکوپ کی تصاویر کی مانند میری آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے۔ جذبات کا ایک طوفان دل میں امنڈ کر بے چین و بیتاب کئے جا رہا تھا اور اسی جذباتی طوفان میں ڈوبتے اُبھرتے میں گھر لوٹ آیا اور اُس رات نیند کئی گھنٹے مجھ سے کوسوں دور رہی اور مَیں بستر پر لیٹا کسی مجبور عاشق کی طرح کروٹیں بدلتا رہا۔

اور آج جب اس کی موت کا سانحہ ہوئے بھی دو سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے، اُس کی یاد ہے کہ بھلائے نہیں بھولتی اور یوں جان پڑتا ہے کہ آج بھی وہ کہیں میرے آس پاس ہے۔ اُس کی آواز، اُس کی باتیں میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ اُس کی موت نے دل پر غموں کا ایک کوہ گراں گرا دیا ہے۔ بڑھتی عمر اور گزرتے

وقت کے ساتھ نہ صبحوں میں وہ تازگی رہی ہے اور نہ شاموں میں سرمستی و کیف۔ آج بیشتر دوست اور عزیز داغِ مفارقت دے گئے ہیں، کچھ وقت کے تھپیڑوں نے مجھ سے دور کر دئے ہیں اور کچھ کو دانہ پانی نے مجھ سے دور کر دیا ہے اور جو باقی بچے ہیں وہ موت کی دستک کے انتظار میں دروازے کی جانب کان لگائے اُس کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایسے تنہائی کے سونے اور کربناک ماحول میں جب زندگی کا چراغ بجھنے کے لئے پھڑ پھڑا رہا ہے تب بھی مجھے کرماں والی کی یاد بے اختیار آجاتی ہے اور مَیں سوچتا ہوں کہ آخر اُس سے میرا کیا رشتہ تھا۔ وہ میری کیا لگتی تھی؟ ایسے لمحے میں جذبات کے طوفان میں گھرا مَیں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور من ہی من قتیلؔ شفائی کا یہ شعر دہرانے لگتا ہوں:

قتیلؔ ایسی بھی اِک عورت ہے اِس رشتوں کی بستی میں

کہ جو ماں ہے، نہ بیٹی ہے، نہ بیوی ہے نہ بہنا ہے

☆☆☆☆☆

زمین میں دفن سچائی

نذیر گزشتہ تین دن سے پرانی دہلی کے علاقوں میں مسلسل چکر لگا رہا تھا جیسے یہاں اُس کا کچھ کھو گیا ہو اور وہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ اسے مل نہیں رہی۔ لیکن اُس کا کیا کھو گیا تھا؟ سب کچھ تو اُس کا کراچی میں صحیح سلامت تھا۔ بیوی بچے، پھلتا پھولتا بیوپار۔ ہر چیز وہاں اُس کے پاس موجود تھی۔ گاڑی، بنگلہ اور ایک وسیع و عریض پلازہ۔ تو پھر وہ یہاں کیوں آیا تھا اور کیا تلاش کر رہا تھا جبکہ یہاں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید دو چار دُور کے رشتہ دور ہوں بھی۔ لیکن نہ تو وہ اُن کے بارے میں زیادہ جانتا تھا اور نہ اُسے اُن کا اتہ پتہ معلوم تھا۔ کیونکہ اُس کے زیادہ تر اعزاء و اقارب بٹوارے کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اور وہ بھی نو دس برس کی عمر میں اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ دہلی سے کراچی چلا گیا تھا۔ اور اب اس شہر میں سوائے ماضی کی تلخ و شیریں یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور شاید اب وہ یہاں گلیوں میں گھوم کر اپنا کھویا ہوا ماضی، اپنا لڑکپن، اور اپنا گھر بار تلاش کر رہا تھا۔

یہ اُس کا آبائی شہر تھا جہاں اس کے آباواجداد صدیوں سے زندگی بسر کرتے آرہے تھے اور اب بھی منوں مٹی کے نیچے گہری نیند سو رہے تھے۔ اسی شہر میں آج سے نصف صدی پیشتر جب اُس نے ہوش سنبھالا تو اس کے دادا اور دیگر رشتہ دار بھی مقیم

تھے۔

اُن دنوں کی دھندلی یادیں اب بھی نذیر کے ذہن وشعور میں موجود تھیں۔وہ پٹودی ہاؤس کے علاقے میں ایک قدیم طرز کے دو تین کمروں پر مشتمل مکان میں اپنے دادا کے ساتھ رہتے تھے جو کسی اسکول میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے کے بعد کئی برس سے سبکدوشی کی زندگی بسر کررہے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ اُسے معلوم نہیں وہ کس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے لیکن ہاں اُسے نے اپنے والد سے اکثر اُن کے بارے میں سنا تھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد کے بڑے معتقد تھے اور انہوں نے خلافت تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔بعدازاں وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی سے متاثر ہوکر تحریکِ آزادی میں شامل ہوگئے تھے اور اس سلسلے میں لگ بھگ دو سال میاں والی جیل میں قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرچکے تھے۔اس کے بارے میں زیادہ تفصیل اُسے اپنے والد کی وفات کے بعد تب معلوم ہوئی جب اُس نے والد اور دادا کی خط وکتابت اور اُن کی نجی ڈائری کا مطالعہ کیا۔

والد کی ڈائری میں ہی اُس نے پڑھا تھا کہ اس کے دادا ماسٹر امتیاز احمد دہلی کے ایک جانے مانے قوم پرست تھے اور اُن کے بارے میں کئی مضامین بھی ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوچکے تھے۔آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''تامر پتر'' اور پنشن دینے کی پیشکش کی تھی جسے اُنہوں نے ٹھکرادیا تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ ''میں آزادی میں حصہ لینے کی قیمت وصول کرنا نہیں چاہتا۔اور ''تامر پتر''......؟ وہ اس لئے قبول نہیں کرسکتا کیونکہ جو وزیر موصوف مجھے

'تامر پتر' دیں گے اُن کا آزادی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر اس 'اعتراف خدمت' کی سند کو حاصل کر کے مَیں کیا کروں گا؟ یہ میرے کسی مصرف کی نہیں"۔ اُن کی اس بات سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی کیونکہ اس کے حصول کے لیے بعض افراد نے تو جعلی سرٹیفکیٹ تک پیش کر کے اپنے آپ کو مجاہدین آزادی میں شامل کرالیا تھا اور اس طرح 'تامر پتر'، پنشن اور دو افراد کا فرسٹ کلاس کا ریلوے پاس حاصل کر کے مزے اڑا رہے تھے۔ ان افراد میں تو کچھ ایسے بھی تھے جو کسی جرم کی پاداش میں جیل گئے تھے لیکن آزادی کے بعد وہ کھدر کے کپڑے اور گاندھی ٹوپی پہن کر مجاہدین آزادی میں شامل ہو گئے تھے اور بعض نے تو الیکشن کا ٹکٹ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ سرکاری عہدہ بھی پالیا تھا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔۔ اسی بنا پر انہوں نے تامر پتر، سرکاری پنشن اور دیگر مراعات کو یکسر ٹھکرا دیا تھا اور درویشانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

اور سچ مچ اُس کے دادا بڑے اصول پرست اور مستقل مزاج تھے۔ اُنہوں نے اصولوں کی خاطر اپنے اکلوتے بیٹے اقبال احمد سے بھی کبھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ اور جب آزادی سے چند سال قبل وہ مسلم لیگ کا سرگرم رکن بن گیا تو انہیں اچھا نہیں لگا۔ اور اس مسئلے پر ان دونوں میں خوب زوردار بحثیں بھی ہوئی تھیں مگر دونوں اپنے اپنے مسلک پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ حالات تیزی سے خراب ہونے لگے اور شہر میں فسادات نے ایسی سنگین صورت اختیار کرلی کہ لاتعداد افراد کو مجبوراً ہجرت کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ ہجرت اور فسادات نے صدیوں کے رشتوں اور بھائی چارے کی جڑوں کو بُری طرح کاٹ کر رکھ دیا تھا اور مشترکہ تہذیب و اقدار کو وقت کی دودھاری شمشیر

نے ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ انسان کا انسان سے اعتبار اُٹھ گیا تھا اور ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ بھائی سے بھائی کا ناتا ختم ہو گیا تھا اور متعدد افراد اپنی جان بچانے کے لئے راہِ ہجرت اختیار کر رہے تھے۔

دہلی کی سنگین صورتِ حال کے کارن انہیں اپنا گھر بار چھوڑ کر پرانا قلعہ میں پناہ لینی پڑی۔ یہاں کچھ دن گزارنے کے بعد جب اُس کے والد نے دیکھا کہ اس کے دادا کسی قیمت پر بھی دہلی چھوڑنے کو تیار نہیں تو وہ اپنے والد کو دہلی ہی میں چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں کو لے کر کراچی چلا گیا اور...... اُس کے دادا اس بھری دنیا میں اکیلے رہ گئے...... یکہ وتنہا...... کیونکہ اس کی دادی کی وفات تو کئی برس پیشتر ہو چکی تھی۔

بیٹے کے چلے جانے کے بعد ماسٹر امتیاز احمد وقتی طور پر ٹوٹ سے گئے تھے۔ آزادی سے پیشتر انہوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ چکنا چور ہو کر اُن کے ارمانوں کی طرح منتشر ہو کر رہ گئے تھے۔ اور اس بارے میں اُنہوں نے ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھا بھی تھا۔۔۔۔۔ 'ہم نے آزادی سے پیشتر ایک متحدہ اور خوشحال ہندوستان کا خواب دیکھا تھا لیکن افسوس کے معلوم تھا کہ ہمارے خوابوں کا یہ المناک حشر ہوگا۔ لیکن شاید خواب اور شکستِ خواب ہی ہمارے اس دَور کا مقدر ہیں۔ لیکن نہیں ہم ہمت نہیں ہاریں گے۔ خواب دیکھنا تو ہمارا ایسا حق ہے جس سے ہمیں کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ اور اب ہم نئے خواب دیکھیں گے...... ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے خواب'۔

اور اس نصف صدی کے وقفے میں دہلی بھی کتنی بدل گئی تھی۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو دہلی کی آبادی کوئی پانچ چھ لاکھ کے قریب تھی جو آج بڑھ کر ایک

کروڑ سے بھی تجاوز کر گئی تھی اور چند میل تک محدود شہر پھیل کر مہرولی سے تیمار پور اور شاہدرہ سے نجف گڑھ تک وسعت اختیار کر گیا ہے اور اس کے آس پاس کی زرعی زمینوں پر بڑی بڑی کالونیاں آباد ہو گئی تھیں اور اس کے تمام گاوؤں شہری آبادی میں گھر کر اسی کا ہی ایک حصہ بن گئے تھے۔ حتا کہ اندرون شہر میں بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ بٹوارے کے بعد مسلمان مہاجرین کے خالی مکان ہندو شرنارتھیوں کو الاٹ کر دئے گئے تھے اور اب وہ علاقے جہاں زیادہ تر مسلمان بستے تھے اب ملی جلی آبادی کے محلے بن چکے تھے۔ یہی نہیں گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں اکثر مکانوں کی توڑ پھوڑ کر کے از سر نو تعمیر کی جا چکی تھی اور بڑی بڑی حویلیوں کو گیسٹ ہاؤسوں اور تجارتی بلڈنگوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

وہ اپنے آبائی مکان کی تلاش میں جب وہاں پہنچا تو اتنی تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں کہ لاکھ ڈھونڈنے اور بھٹکنے پر بھی اسے وہ حویلی نہ ملی جہاں اُن کا مکان واقع تھا۔ آخر اُس نے ایک دکاندار سے پوچھا۔ ”کیوں صاحب یہاں حویلی حیدر بخش کہاں ہے؟“

”وہ شخص کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سر کھجلاتا ہوا بولا۔ ”صاحب مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ پھر کچھ ثانیے سوچنے کے بعد اُس نے کہا۔ ”آپ ایسا کریں کہ یہاں سے پانچ چھ دکان آگے حکیم نور الدین صاحب بیٹھتے ہیں، اُن سے پوچھیے وہ ضرور آپ کو بتا سکیں گے کیونکہ وہ یہاں کے پرانے باشندے ہیں۔“

وہ دکاندار کو سلام کر کے آگے بڑھا اور حکیم صاحب کی دکان پر پہنچ کر اُس نے حکیم صاحب کو سلام کیا اور کہا۔

''معاف کیجیے گا۔ کیا آپ مجھے حویلی حیدر بخش کا پتہ بتا سکیں گے؟ مَیں کافی دیر سے پریشان ہو رہا ہوں مگر مجھے حویلی کا اتہ پتہ نہیں مل رہا۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں گے؟

حکیم صاحب نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کچھ لمحے اُسے غور سے دیکھنے کے بعد بولے۔ حضرت کہاں سے آرہے ہیں؟''

''جی کراچی سے؟''

''اچھا؟' پھر کچھ ثانئے سوچنے کے بعد بولے۔''؟'' وہاں حویلی میں کون رہتا ہے؟''

''دراصل ہم لوگ بٹوارے سے پہلے وہاں رہا کرتے تھے۔ میرے والد تو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے مگر میرے دادا یہیں رہ گئے تھے۔ اب مَیں اُس حویلی کو دیکھنے کی غرض سے خصوصی طور پر یہاں آیا ہوں جہاں میں نے بچپن اور لڑکپن کے دن گزارے تھے۔ اور اس کے علاوہ مَیں اپنے دادا کے بارے میں بھی پرانے لوگوں سے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

حکیم صاحب کچھ لمحے کسی سوچ میں ڈوبے رہے کیونکہ انہیں بات کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ پھر بڑے تذبذب کے بعد رُک رُک کر یوں گویا ہوئے۔ ''دیکھیے حویلی حیدر بخش اب آپ کو کہاں ملے گی؟ وہاں تو اب ایک گیسٹ ہاؤس بن چکا ہے؟' ہاں اگر آپ اُسے دیکھنا چاہیں تو یہاں سے بیس پچیس گز آگے داہیں ہاتھ پر ایک دو منزلہ عمارت واقع ہے جہاں ''احمد گیسٹ ہاؤس'' لکھا ہوا ہے بس وہی کبھی حویلی حیدر بخش تھی۔''

اُسے بڑا دھچکا لگا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور ''اچھا جناب شکریہ''
کہہ کر مایوسی کے عالم میں چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اُٹھتے دیکھ کر حکیم صاحب
نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے حضرت بیٹھئے تو سہی۔ آپ اتنی دور سے
آئے ہیں۔ کوئی چائے یا شربت؟''

''جی نہیں شکریہ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مَیں نے چائے پی ہے''

''خیر کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر ستا ہی لیجئے۔ آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں۔ اور یہ بتائیے آپ کے دادا جان کا کیا نام تھا اور وہ کیا کرتے تھے؟''

''جی اُن کا نام ماسٹر امتیاز احمد تھا اور وہ اسکول ٹیچر تھے''

''کیا آپ ماسٹر امتیاز احمد صاحب کے پوتے ہیں؟'' حکیم صاحب بات
کرتے کرتے اچانک اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''جی''

'ارے وہ تو میرے اُستاد تھے۔ مَیں اُن کے پاس چوتھی پانچویں جماعت
میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ تو بڑے مشہور نیشنلسٹ تھے۔''

اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور حیرت سے بولا۔ ''تو کیا آپ
میرے دادا کو جانتے ہیں''

''صاحب مَیں ہی نہیں پرانے سبھی لوگ اُن سے آشنا ہیں۔ وہ تو علاقے
کے مشہور سوشل ورکر تھے اور انتہائی ایماندار۔ سبھی لوگ اُن کی بڑی عزت کرتے
تھے۔''

اپنے دادا کے بارے میں یہ سب جان کر اُسے بے حد خوشی ہوئی۔ وہ چاہتا

تھا کہ وہ اُن کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید سوال کرتا ، حکیم صاحب نے ہی اُس سے پوچھ لیا۔ ''مگر اُن کی وفات کو تو لگ بھگ تیس سال گزر چکے ہیں اور آپ آج اتنی مدت بعد اُن کے بارے میں جاننے کے لئے آئے ہیں؟ آخر کیا ضرورت آپڑی؟

''جی اصل میں میرے والد کا گزشتہ سال انتقال ہو گیا ہے۔اُن کی ڈائری پڑھ کر مجھے اپنے دادا جان کے بارے میں مزید جاننے ، اپنے آبائی مکان کو دیکھنے اور اپنے دادا کی قبر پر ایک بار فاتحہ پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔اور اسی خواہش کے زیرِ اثر میں دو تین دن پہلے یہاں آیا ہوں۔''

حکیم صاحب اُس کی بات سُن کر اُداس سے ہو گئے۔ معلوم نہیں وہ ماضی کی کن یادوں میں کھو گئے تھے۔ پھر کچھ لمحے یوں ہی گُم سُم رہنے کے بعد بولے۔

''لیکن وہ تو یہاں دفن نہیں ہیں۔ کیونکہ انتقال سے کچھ مدت پہلے انہیں اُن کے دوست کامریڈ ہیرالال مہرولی کے قرب واقع اپنے آبائی گاؤں لے گئے تھے اور وہی انہیں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔''

''ہاں مَیں جانتا ہوں۔انہوں نے اپنی وفات سے کچھ ہفتے پہلے ایک خط میں والد صاحب کو لکھا تھا کہ اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی لہذا اُن کے دیرینہ دوست چوہدری ہیرالال انہیں اپنے آبائی گاؤں لے کر جارہے ہیں۔''

حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر بولے۔ ''ہاں اُن کا گاؤں مہرولی سے دو تین میل کی دُوری پر واقع ہے۔مَیں بھی ماسٹر جی کے انتقال کے بعد صرف ایک بار اُس گاؤں گیا تھا جب انہیں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔اُس کے بعد کبھی وہاں جانے کا

اتفاق نہیں ہوا ۔اب معلوم نہیں ہیرالال زندہ بھی ہیں یا نہیں۔لیکن اُن کے خاندان کے دیگر افراد تو ہوں گے۔آپ وہاں جا کر اُن سے ملئے۔وہی لوگ آپ کی اس معاملہ میں رہنمائی کر سکیں گے۔"

اتنی معلومات حاصل ہو جانے پر اُس نے حکیم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکلتے ہی اُس نے سوچا، حویلی اور مکان تو باقی نہیں رہا لیکن چلو وہ جگہ ہی دیکھ لیں جہاں ہم سبھی اپنے دادا جان کے ساتھ کبھی رہا کرتے تھے۔یہ سوچ کر وہ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچا جہاں گیسٹ ہاؤس واقع تھا۔وہاں اُس نے دیکھا کہ کئی کمروں پر مشتمل ایک دو منزلہ عمارت کھڑی ہے اور پرانی حویلی کا نام ونشان تک بھی باقی نہیں۔آس پاس کا ماحول بھی یکسر بدل چکا تھا۔پاس پڑوس کے وہ مکان جو اُس کی یادداشت میں ابھی تک باقی تھے، کہیں نظر نہ آئے اور پرانے مکین تو شاید ہجرت کر گئے تھے یا راہی ملکِ عدم ہو چکے تھے اور نئی نسل سے وہ واقف نہیں تھا۔آس پاس کا بھی سارا ماحول بدلا بدلا سا تھا۔کئی لمحے وہ اُس عمارت کے سامنے کھڑا یادوں کے بحرِ بیکراں میں غرقاب رہا اور جب ذرا سنبھلا تو وہ اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کی غرض سے ایک ٹیکسی پکڑ کر کامریڈ ہیرالال کے گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔

حکیم صاحب کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچنے کے بعد بھی اُسے کہیں گاؤں نظر نہ آیا کیونکہ چاروں طرف نئی کالونیاں آباد ہو جانے سے گاؤں شاید اُن کے بیچ کہیں غائب ہو گیا تھا۔آخر چند افراد سے پوچھنے کے بعد اُسے ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہاں سے ایک فرلانگ کی دوری پر واقع بائیں ہاتھ کی گلی

میں کوئی دو سو گز اندر جانے کے بعد مذکورہ گاؤں کی آبادی شروع ہو جائے گی۔

وہ بہت تھک چکا تھا۔ اُس نے ٹیکسی والے سے بتائے ہوئے راستے کی طرف چلنے کی تلقین کی اور خود آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن ٹیکسی چند ہی منٹوں میں گاؤں میں داخل ہو گئی اور اس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور وہ ٹیکسی سے اُتر کر پیدل ہی چل پڑا کیونکہ اب آگے گلیاں تنگ تھیں۔ پھر گلی کے کونے میں چھوٹی سی دکان پر بیٹھے ایک شخص سے اُس نے چوہدری ہیرالال کے مکان کا پتہ پوچھا اور بغیر کسی وقت کے سیدھا وہاں پہنچ گیا۔

مکان سے معلوم ہوتا تھا کہ پرانے مکان کو توڑ کر اسے نیا نیا تعمیر کیا گیا ہے۔ کچھ دیر وہ کسی کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا اور جب کوئی باہر نہ نکلا تو اُس نے باہر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا جس کی آواز سُن کر ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے دروازہ کھولا اور انہیں اندر جا کر بیٹھک میں بٹھا دیا جہاں ایک ستر اسی سال کے بزرگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی بغیر کوئی سوال کئے انہوں نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر بولے ”کہیے؟“

”جی میں کراچی سے آیا ہوں اور چوہدری ہیرالال جی سے ملنے چاہتا ہوں۔“

بوڑھے نے حقے کا ایک لمبا کش لیا اور کچھ توقف سے بولا ”مگر اُن کی وفات ہوئے تو بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں“

”اوہ“ اُس نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ کو اُن سے کیا کام تھا؟“

”دراصل۔ میرے دادا ماسٹر امتیاز احمد اُن کے دوست تھے اور شاید اُن کا

انتقال بھی آپ ہی کے گھر میں ہوا تھا۔"

"اچھا، اچھا! تو آپ اقبال احمد صاحب کے بیٹے ہیں جو کراچی میں رہتے ہیں۔"

"جی۔"

"کیسے ہیں وہ؟"

"جی اُن کا تو گزشتہ سال انتقال ہو گیا تھا۔ اور اب اُن کی موت کے بعد مجھے دادا جان کی بے اختیار یاد آ رہی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اُن گلی کوچوں کو بھی دیکھنے کا شوق تھا جہاں مَیں نے اپنا بچپن گزارا ہے۔ اس لئے میں چند دن پہلے یہاں آیا ہوں۔"

"بھئی بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر چچا امتیاز اکثر تمہارا اور اقبال کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ خاص کر موت سے چند دن پہلے تو وہ اقبال کو بہت ہی یاد کرتے تھے۔ اُن کی اور باپو کی بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر ایک ساتھ ہی گرفتار ہوئے تھے اور ایک ہی جیل میں ڈیڑھ دو برس رہے تھے۔ وہ جب بہت بیمار ہو گئے تو اُن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے باپو انہیں یہاں گھر لے آئے تھے اور یہیں اُن کا انتقال ہوا تھا۔" پھر وہ بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولے۔

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو بتایئے کہاں ٹھہریں ہیں آپ؟"

"جی مَیں جامع مسجد کے علاقے میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں" نذیر نے جواب دیا

"بھئی یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں ٹھہرے

ہیں۔ آپ سیدھے یہاں کیوں نہیں چلے آئے؟"

"جی مجھے آپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو حکیم نورالدین صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔"

"چلئے اب آپ اپنا سامان لے کر یہیں آ جائیے۔ ہوٹل میں قیام کی ضرورت نہیں۔"

"جی شکریہ لیکن کل شام کی فلائیٹ سے مَیں واپس کراچی جا رہا ہوں۔ اگلی بار جب آؤں گا تو آپ ہی کے پاس ٹھہروں گا۔ مگر فی الحال آپ میری تھوڑی مدد کیجئے۔ مَیں اپنے دادا صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے وہاں تک لے چلیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

ارے بھئی مہربانی کیسی۔ لیکن......

"لیکن کیا؟ کیا وہ جگہ بہت دُور ہے؟"

"نہیں ایسی بات تو نہیں لیکن......" وہ کچھ شش و پنج میں دکھائی دے رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کسی سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولے۔ "خیر ابھی کچھ کھا پی لیجئے۔ پھر چلتے ہیں۔"

"چچا کوئی تکلف نہیں۔ پہلے وہاں چلتے ہیں واپسی پر چائے پی لیں گے۔"

"اچھا" یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور جلدی سے کپڑے بدل کر دھیرے دھیرے اُس کے ساتھ گاؤں سے باہر نکل آئے جہاں چاروں جانب بڑی بڑی رہائشی اور تجارتی عمارتیں کھڑی تھیں۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے بتایا۔ "یہ عمارتیں دیکھ رہے ہو یہاں کچھ عرصہ پیشتر ہمارے کھیت تھے لیکن آج یہاں جنگل میں منگل

ہو گیا ہے۔ اب گاؤں والوں کے پاس روپیہ بھی بہت آ گیا ہے اس لئے اب وہ کاشتکاری کے بجائے مختلف دھندوں میں لگ گئے ہیں۔'' باتیں کرتے کرتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔ پھر ایک جگہ رک کر وہ بولے۔ ''بھئی کیوں نہ پہلے کچھ کھا پی لیا جائے۔ مجھے بڑی پیاس بھی لگی ہوئی ہے۔''

اُس نے اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی''

پھر وہ دونوں سامنے ہی واقع ایک ریستوراں میں جا گھسے اور جاتے ہی چوہدری صاحب نے بیرے کو آرڈر دیا۔ ''ارے دو کولڈ ڈرنک' اور کچھ کھانے کو لے آؤ۔''

''کیا کھائیں گے جناب؟''

''سموسے اور آلو کی ٹکیا لے آؤ''

اُس وقت سہ پہر کا وقت تھا اس لئے ریستوراں میں زیادہ بھیڑ بھی نہیں تھی۔ بیرا چند منٹ میں ہی کولڈ ڈرنک اور سموسے وغیرہ لے آیا۔اور وہ دونوں کھانے میں منہمک ہو گئے۔ کھانے کے بعد جب وہ کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لے رہے تھے تبھی چوہدری صاحب نے بڑے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

''بیٹا! قدرت کی ستم ظریفی دیکھو۔ آپ ہزاروں میل دُور سے اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے یہاں آئے ہیں لیکن افسوس کہ مَیں آپ کی مدد کرنے سے اپنے آپ کو معذور پا رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' نذیر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا

''کیونکہ گزشتہ چند دہوں میں لوگوں نے کھیت تو کھیت قبرستان تک بیچ کر

رہائشی کالونیاں بنادی ہیں ۔اور جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ وہی قبرستان ہے جہاں تمہارے دادا کو سپردِ خاک کیا گیا تھا۔"

یہ سُن کر نذیر کو کرسی پر بیٹھے ہونے کے باوجود بڑے زور سے چکر سا آگیا اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان بڑی تیزی سے گردش کرنے لگا ہے اور زمین یک لخت پھٹ گئی ہے اور وہ اُس میں دھنستا جارہا ہے......دھنستا جارہا ہے۔

☆☆☆☆☆

سہما ہوا آدمی

جوں جوں شام کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا توں توں راجن کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار عالمِ پریشانی میں گیٹ پر جا کر دیکھتا کہ شاید اُس کی بیٹی ریما سکوٹر یا رکشے پر گھر آ رہی ہو مگر ہر بار اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ پریشان تو بیٹی کے نہ آنے کی وجہ سے رنجنا کو بھی ہو رہی تھی مگر وہ اپنے شوہر کی طرح کسی پریشانی کا اظہار کر کے اُس کی پریشانی میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اندر سے وہ بھی مختلف اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی تھی لیکن بظاہر وہ بڑے صبر و تحمل کا اظہار کر رہی تھی تاکہ اُس کے شوہر کی پریشانی میں مزید اضافہ نہ ہو۔ وہ بار بار شوہر کو آرام سے بستر پر لیٹ جانے اور چائے پینے کے لئے اصرار کر رہی تھی مگر وہ تھا کہ اُسے کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کبھی کمروں کے چکر کاٹ رہا تھا اور کبھی گیٹ پر جا کر دُور تک اندھیرے میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس دوران وہ اُس کی ایک دو سہیلیوں کے گھر بھی ٹیلی فون کر چکا تھا مگر وہاں سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں گئی۔ مگر یہ ایک دن کی تو بات نہیں تھی جب بھی اس کے آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تھی وہ پریشان ہو اُٹھتا تھا۔ اور جب تک وہ

گھر نہیں آتی تھی وہ اسی طرح پریشان کمرے کے چکر کاٹتا رہتا اور بار بار گیٹ پر جا کر دیکھتا تھا کہ وہ تھری ویلر یا رکشے پر آ تو نہیں رہی۔

راجن کو اس طرح متفکر و پریشان دیکھ کر رنجنا ہمیشہ اُسے سمجھاتی کہ وہ بلا وجہ پریشان ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں ٹریفک کی وجہ سے لوگ اکثر گھر دیر سے پہنچتے ہیں، مگر پھر بھی اس کے اضطراب و پریشانی میں کمی نہ آتی اور رنجنا کے لیٹ ہونے کی وجہ سے اُس کی بے چینی اور اضطرار میں بتدریج اضافہ ہوتا رہتا۔ مگر یہ پریشانی اور اضطراب پہلے نہیں تھا جب وہ ننھی منی کمسن بچی تھی۔ تب لوگ اُس کی خوبصورتی کی تعریف کرتے تو اُسے بہت اچھا لگتا تھا مگر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی وہ کسی انجانے خوف کی وجہ سے پریشان رہنے لگا۔ اور اب جب کہ وہ بیس اکیس سال کی ایک انتہائی حسین دوشیزہ میں بدل چکی تھی اُسے اندر ہی اندر کوئی خوف......کوئی ڈر ستانے لگا تھا۔

جب سے اُس نے جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھا تھا، وہ اُس کی حرکات وسکنات پر بڑی نظر رکھتا تھا۔ وہ اسکول کے بعد اگر لیٹ ہوگئی ہے تو کیوں؟ اگر وہ کسی سہیلی کے گھر گئی ہے تو اُس کا کیا نام ہے اور وہ کہاں رہتی ہے؟ اُس کے ماں باپ کیا کرتے ہیں۔ وہ کتنے بہن بھائی ہیں؟

مگر ایسا نہیں تھا کہ اُس کی ماں فکر نہیں کرتی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی پریشانی کے کارن اپنی پریشانی کا اظہار نہیں کرتی تھی تا کہ کہیں بیٹی کا اُس پر بُرا اثر نہ پڑے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے شوہر کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ کیوں وہ یوں پریشان ہو جایا کرتا ہے؟

دراصل اُن دونوں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف گھر سے بھاگ کر

سول میرج کی تھی۔ جس کے نتیجے میں انہیں کئی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ والدین سے بھی اس کارن اُن کی ناراضی ایک مدت تک چلتی رہی اور اُن سے اُن کا سمجھوتہ بھی ریما کی پیدائش کے بعد ہی ہوا۔

کبھی کبھی باہر سے آنے پر اپنے باپ کو اس طرح پریشان دیکھ کر ریما چڑ جاتی اور اُس سے غصے میں سوال کر بیٹھتی۔ ''پاپا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مجھ پر یقین نہیں اور آپ........

نہیں بیٹی! یہ بات نہیں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے مگر مَیں کیا کروں؟ لاکھ چاہنے پر بھی مَیں تمہارے لیٹ ہو جانے پر پریشان ہو جاتا ہوں اور طرح طرح کے خیالات میرے من میں پیدا ہونے لگتے ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو۔ لیکن کیا کروں؟ سمجھ نہیں آتا۔''

باہر سے تھکی ماندی آئی ریما کو اس بات سے کچھ تشفی ہو جاتی ور وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو جاتی۔ لیکن کبھی کبھی وہ تنہائی میں سوچتی، آخر پاپا اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟ آخر دوسری لڑکیوں کے ماں باپ بھی تو ہیں؟ مگر میری سہیلیوں کی تو زیادہ تر مائیں چنتا میں ڈوبی رہتی ہیں اور یہاں باپ؟ عجیب بات ہے ماں نے کبھی یوں فکر نہیں کی۔۔ اور پھر یہی سوچتے سوچتے وہ گہری نیند میں کھو جاتی۔

بچپن میں ریما تھی بھی اتنی خوبصورت کہ ہر ایک اُسے گود میں اُٹھا لیتا اور پیار کرتا۔ مگر جب اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو راجن کو اندر ہی اندر کوئی فکر ستانے لگی۔ پھر اُن ہی دنوں ایک دن اُس نے ایک رسالے میں ایک لوک کہانی پڑھی کہ ایک شہزادہ کسی ریاست کی راجکماری کو ایک اُونٹنی پر بھگا کر اپنی ریاست کی جانب

جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ندی میں سے اُسے گزرنا پڑا۔ جب اُونٹنی ندی کے عین بیچ میں پہنچی تو وہ وہاں بیٹھ گئی۔ شہزادے کو ڈر تھا کہ کہیں شہزادی کی ریاست کے سپاہی آ کر اُسے پکڑ نہ لیں لہٰذا اُس نے اُونٹنی والے سے کہا کہ اسے جلدی سے اُٹھاؤ ورنہ ہم پکڑیں جائیں گے۔ تب اُونٹنی والے نے کہا حضور فکر نہ کریں پانچ سات منٹ میں یہ خود بخود اُٹھ کر دوڑنے لگے گی۔ اس سے پہلے اسے اُٹھایا نہیں جا سکتا۔ شہزدے نے خوف کے عالم میں پوچھا۔ ''کیوں؟'' اُونٹنی والے نے جواب دیا حضور یہ اس کی خاندانی عادت ہے۔ اس کی ماں بھی اسی طرح پانچ سات منٹ ندی کے بیچ یوں ہی بیٹھ جایا کرتی تھی اور پھر اُٹھ کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ آپ جانتے ہیں خاندانی عادتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔'' یہ سُن کر شہزادے کے من میں اچانک یہ خیال بجلی کی طرح کوندگیا تو کیا میں جس راجکماری کو بھگا کر لے جا رہا ہوں کل اس کی بیٹی بھی اُس کی طرح کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی؟ یہ خیال آتے ہی اُس نے اُونٹنی کو واپس موڑنے کا حکم دیا اور راجکماری کو اُس کے شہر میں چھوڑ کر خود واپس اپنی ریاست میں چلا گیا۔

یہ کہانی پڑھ کر راجن کو بھی مزید وہم ہو گیا کہ اُس کی بیٹی بھی کسی نوجوان کے ساتھ بھاگ کر چپکے سے شادی رچا لے گی، اپنی ماں کی طرح۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ یہ بات اُس کے ذہن سے نکل جائے مگر لاکھ چاہنے پر بھی وہ اپنے من سے یہ بات نکال نہیں پا رہا تھا۔ عجیب نفسیات ہو گئی تھی جب وہ کسی اخبار میں کسی لڑکی کے اغوا یا اُس کے ریپ کا قصہ پڑھتا یا ٹی وی پر دیکھتا تو اُسے ایسا احساس ہوتا جیسے یہ واقعہ اُس کی بیٹی کے ساتھ وقوع پذیر ہوا ہو، اور وہ پریشان ہو اُٹھتا، اُس کی نیند غائب

ہو جاتی۔ رنجنا اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔

وہ رات گھنٹوں جاگتا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ وہ کئی کئی بار اُٹھ کر رنجنا کے کمرے میں جا کر جھانکتا اور دیکھتا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے یا کسی سے ٹیلی فون پر بات تو نہیں کر رہی۔ یہی نہیں اُس نے گزشتہ سال آئی ڈی کالر والا فون خرید لیا تھا تاکہ اُسے پتہ لگ جائے کہ اُسے کسی نے ٹیلی فون تو نہیں کیا یا اُس نے کس کس کو فون کیا ہے؟۔ وہ روز رات کو چپکے سے دیکھا کرتا تھا کہ دن میں کس کس کے ٹیلی فون آئے ہیں اور کس کس نے فون کئے ہیں؟

اچانک نیچے تھری وہیلر کے رکنے کی آواز آئی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا ریما آٹو رکشا والے کو پیسے دے رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اُس کی جان میں جان آئی۔ اُس کے اُوپر آتے ہی اُس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''بیٹا! اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔''

ریما نے ایک بار غصے سے باپ کی جانب دیکھا۔ پھر اُن کی اس فطرت سے واقف ہو جانے کی وجہ سے بڑے صبر و تحمل سے بولی۔ ''پاپا! آپ تو یوں ہی فکر کرتے رہتے ہیں۔ مہانگروں میں لیٹ ہو جانا معمولی بات ہے۔ آپ کو کئی بار سمجھایا۔ مگر آپ ہیں کہ ہمیشہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ آج پہلے تو دفتر میں لیٹ ہو گئی اور پھر اتفاقاً بس آئی ٹی او کے پاس خراب ہو گئی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ آٹو رکشا مل گیا ورنہ شاید اور دیر ہو جاتی۔'' اتنا کہہ کر وہ کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جب رات کے کھانے کے بعد رنجنا سونے کے لئے اپنے کمرے میں پہنچی تو اُس نے دیکھا وہ حسب معمول کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہ

تھی۔ وہ جب بھی کمرے میں آتی وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ملتا یا ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہوتا۔ نیند اُس سے کوسوں دور ہوتی۔ وہ اُسے سونے کی تلقین کرتی مگر معلوم نہیں وہ کب سوتا تھا۔ کیونکہ وہ تھکی ماندی اُسے سمجھاتے سمجھاتے نہ جانے کب سو جاتی تھی۔

اُس کی اس عادت سے وہ ہمیشہ متفکر رہتی مگر اُسے سمجھ نہیں آتا تھا۔ اُسے کیسے سمجھائے۔ اسی دوران ایک دن اُس کی چچیری بہن شاردا اپنے شوہر ڈاکٹر سچدیوا کے کے ساتھ امریکہ سے دہلی آئی تو اُن سے ملنے اُن کے گھر آ گئی۔ جب اُنہوں نے ریما کو دیکھا تو وہ انہیں ایسی بھائی کہ انہوں نے فوراً ہی اپنے بیٹے کی اُس سے شادی کی تجویز رکھ دی۔ رنجنا تو اس اچانک پیش کش سے سکتے میں آ گئی۔ کیونکہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس فیملی میں اُس کی بیٹی کی شادی بھی ہو سکتی ہے؟ کیونکہ وہ لوگ بہت امیر تھے۔ شاردا کے شوہر کا نیو یارک میں اپنا نجی کلنک تھا اور اب اُس کے بیٹے نے بھی ڈاکٹری کی سند پانے کے بعد پریکٹس شروع کی تھی۔ وہ اُس تجویز پر ہاں کرنا چاہتی تھی مگر اُس نے دیکھا کہ راجن کا چہرہ اُتر گیا ہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ اس پر شاردا نے اُسے یوں خیالوں میں ڈوبے دیکھ کہا۔ "کیوں جیجاجی! کیا میری بات آپ کو پسند نہیں۔؟

راجن نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔ "نہیں تو۔۔۔ مگر۔۔۔"

مگر کیا؟" شاردا نے فوراً اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اب راجن سوچ میں پڑ گیا کہ اُنہیں کیا جواب دے؟۔ وہ تو اس تجویز سے اندر ہی اندر کانپ اُٹھا تھا۔ اُس نے امریکہ اور انگلینڈ میں شادی کر کے جانے والی لڑکیوں کے مصائب اور پریشانیوں کے کئی قصے سنے ہی نہیں تھے، اخباروں میں

پڑھے بھی تھے۔ کتنے لوگوں کے ساتھ شادی کے نام پر غیر ملکوں میں بسے ہندوستانیوں نے دھوکا کیا تھا۔ مگر وہ انکار کرے تو کیسے کرے؟۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ ڈاکٹر سچدیوا نے بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔" دیکھئے راجن صاحب! ریما آپ کی ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے اور آخر ماں اور موسی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اور پھر آپ کی بھی صرف ایک بیٹی ہے اور میرا بھی ایک بیٹا۔ اس شادی سے آپ کو بیٹا مل جائے گا اور مجھے بیٹی۔"

ڈاکٹر سچدیوا کی بات راجن کو کچھ بھا گئی۔ اور پھر بیٹی کی شادی تو کرنی ہی تھی لہٰذا شادی کی اس تجویز کو اُس نے بے دلی سے قبول کر لیا اور چونکہ اُن لوگوں کو دس دن کے بعد امریکہ واپس چلا جانا تھا اس لئے چند دنوں ہی میں شادی ہوگئی اور ریما بھی کچھ مدت بعد سسرال چلی گئی۔ اُسے ہوائی اڈے پر رخصت کرتے وقت جب راجن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو رنجنا نے سوچا شاید یہ اُس کے آخری آنسو ہیں۔ کیونکہ اب وہ اپنی بیٹی کی فکر سے آزاد ہو گیا ہے اور بیٹی اچھے شریف اور امیر گھرانے میں شادی کے بعد اپنے سسرال چلی گئی ہے۔ مگر اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ وہ اب بھی اُسی طرح اُداس رہتا حالانکہ اُس کی بیٹی، داماد اور اُس کے گھر والے ہر ہفتہ فون پر خیر و عافیت کی خبر دیتے رہتے تھے مگر اُس کی اداسی تھی کہ جوں کی توں قائم رہی۔ وہ اُسی طرح رات دیر تک جاگتا کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ جانے اُس کی بیٹی پر کیا بیت رہی ہوگی؟ اُس کے سسرال والے اُس سے کیا سلوک کرتے ہوں گے۔ کہیں وہ لوگ ٹیلی فون پر جھوٹ تو نہیں بولتے؟

اُسے یوں فکر و غم میں مبتلا دیکھ رنجنا کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ لاکھ

سمجھانے پر بھی اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایک دن وہ اسی چنتا میں ڈوبی ہوئی تھی کہ امریکہ سے ڈاکٹر سچدیوا کا فون آیا جسے سُن کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فون سننے کے بعد اُس نے فوراً راجن کو اُس کے دفتر فون کیا اور بغیر کوئی تمہید باندھے کہا۔ ''مبارک ہو۔''

''مبارک؟ کس بات کی مبارک۔؟

''ریما کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ آپ نانا بن گئے ہیں۔''

اچانک یہ خبر سن کر اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رنجنا سے کیا کہے۔ اسی طرح کچھ ثانئے چُپ رہنے کے بعد اُس نے صرف اتنا کہا۔ ''اچھا میں گھر آتا ہوں۔''

لیکن جب تک وہ گھر پہنچا تو فون کا زمانہ ہونے کی وجہ سے یہ خبر رشتہ داروں اور پاس پڑوس میں جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔ جب وہ گھر پہنچا تو کئی رشتہ دار اور پڑوسی مبارکباد دینے کے لئے جمع ہو چکے تھے۔ گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ عالمِ مسرت میں رنجنا سب کی خاطر تواضع مٹھائی، کوک اور چائے سے کر رہی تھی۔ آتے ہی وہ بھی اُس کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گیا۔ جب رات ہو جانے پر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو رنجنا تھکن سے چور چور ہو چکی تھی۔ رسوئی میں برتنوں کو سنبھالنے کے بعد اُس نے جلدی سے نائٹ گاؤن پہنا اور سونے کے لئے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آج راجن نہ تو جاگ رہا تھا اور نہ ہی ٹیلی ویژن دیکھ رہا تھا بلکہ وہ گہری نیند میں سویا ہوا تھا اور اُس کے خراٹوں کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ ☆☆☆☆

سینی ٹوریم کے دروازے سے

زیبی!

تم نے تو اب بھی مسکرانا نہیں چھوڑا ہوگا مگر میرے وہ قہقہے اب پھیکی مسکراہٹ میں تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔ احباب و اقارب میری اس تبدیلی سے نالاں و ششدر ہیں۔ اور مَیں ہوں کہ غمِ ماضی کی تلخ یادوں میں گھل گھل کر اپنے آپ کو سینی ٹوریم کی طرف لئے جا رہا ہوں۔ اور شاید ایک دن تمہیں اس المیے اور حیران کن خبر کو سننے پڑے کہ مَیں اس دنیائے فانی سے دُور کسی انجانی دنیا میں سکونت پذیر ہو گیا ہوں۔ اُس وقت شاید چند لمحوں کے لئے تمہاری مسکراہٹ چھن جائے۔ تمہاری شوخ اور مسکراتی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمنڈ آئے جسے تم انتہائی کوشش کے باوجود بھی نہ روک سکو اور ان اشک آلود آنکھوں کو بند کر کے تم اپنی کوٹھی کے گول کمرے میں بچھے صوفے پر گر کر ماضی کی تلخ یادوں میں کھو جاؤ۔

مگر یہ یادیں بھی کبھی کتنی مسرت افزا اور کیف بخش تھیں!

اور آج یہ تپ دق کے جراثیم بن کر میرے نازک اور کمزور جسم کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔

زیبی! کیا تمہیں بھی میری موت کا احساس ہوگا؟

کیا تم بھی ان گزرے ہوئے کاروانوں کی صدائے جرس سن رہی ہو؟

نہیں ...... شاید نہیں ...... کیونکہ تم تو یہاں سے سینکڑوں میل دُور ...... سری نگر میں اپنی کوٹھی میں بیٹھ کر اپنے بھیا اور بھابھی کے ساتھ تاش کھیلنے میں منہمک ہوگی اور تاش کی بازی جیتنے کی کوشش میں تم مجھے تو کیا اپنے آپ کو بھی بھول گئی ہوگی۔ کیونکہ یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ جالندھر میں بھی جب کبھی ہم تاش کھیلتے تھے تو تم ہمیشہ جیتتی تھیں۔ جیسے تمہاری قسمت میں ہمیشہ جیتنا ہی لکھا ہو۔ اور مَیں تو اپنا سب کچھ ان تاش کی بازیوں میں ہار چکا تھا۔ یہاں تک کہ اپنا سرمایۂ حیات بھی۔ شاید مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی۔

مگر اب ان ماضی کی یادوں میں کیا رکھا ہے؟

طوفان سر سے گزر جانے کے بعد کیا ہوسکتا ہے؟

وہ سہانی راتیں ...... وہ راحت بخش دن مجھے دو سال گزر جانے کے بعد بھی نہیں بھولے۔

اور شاید زندگی بھر مَیں انہیں فراموش نہیں کر سکوں گا ...... اور موت کے بعد کون جانے کیا ہوگا؟ کاش انسان اپنے ماضی کو بھول سکتا تا کہ وہ میری طرح غم واندوہ کے گہرے سمندر میں غرق ہو کر اپنی ہستی مٹانے پر مجبور نہ ہوتا اور ماضی کی یادوں میں گُھل گُھل کر اپنے آپ کو تباہ و برباد نہ کر دیتا۔

تمہیں دیکھنے سے پیشتر زندگی کتنی پُر سکون تھی۔ کوئی غم نہ تھا اور غم محبت سے تو مَیں روشناس تک نہ تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ مجھے پارٹی کے کاموں سے ہی

فرصت نہ تھی۔ اس اثنا میں تم چپکے سے مسکرا مسکرا میری زندگی میں داخل ہوئیں اور میرے صبر و قرار لوٹ لئے۔ پارٹی کا کام کرتے کرتے اچانک مجھے تمہاری یاد آجاتی اور مَیں بے اختیار تمہاری دیدی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاتا جہاں تمہارے تبسموں کی بوچھار میرا سواگت کرتی اور ایک مختصر عرصہ کے لئے پارٹی تو پارٹی میں دنیا کی تمام سرگرمیوں کو بھول جاتا۔ میری دنیا سمٹ کر اس کوٹھی تک محدود ہو جاتی۔ کئی گھنٹے باتوں میں گزر جاتے لیکن احساس تک نہ ہوتا۔ اچانک دیوار پر لگی گھڑی رات کے گیارہ بجا کر مجھے چونکا دیتی۔ مَیں پھر اپنی دنیا میں لوٹ آتا کیونکہ مجھے پارٹی کے کئی کام کرنے ہوتے تھے اور مَیں تمہاری مسکراہٹوں میں کھو کر دنیا و مافیہا کو بھول چکا تھا۔

رات گئے جب مَیں اپنے کمرے میں لوٹتا تو نیند مجھ سے کوسوں دور ہوتی۔ سونے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی مجھے نیند نہ آتی۔ مَیں تمہارے تصور میں کھویا رہتا۔ کئی کئی گھنٹے اس طرح گزر جانے کے بعد جب اچانک مجھے نیند آجاتی تو تم وہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ اور ہم اس غیر رومانی شہر سے دور ویری ناگ اور اچھا بل کے پُر کیف ماحول میں پہنچ جاتے۔ ہم فضا میں اُڑتے اُڑتے امرناتھ سے بھی آگے نکل جاتے۔ کاش ہم ہمالیہ کی سب سے اُونچی چوٹی پر پہنچ جاتے۔ لیکن یہ کبھی نہ ہو سکا اور مَیں پھر اسی وادیٔ زنداں میں لوٹ آتا۔

جب مَیں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے وہم و گمان تک نہ تھا کہ یہ ملاقات ایک دن ایک المیہ بن کر رہ جائے گی۔ مگر مستقبل کے طوفانوں کا کسے پتہ ہوتا ہے؟

اس کا پتہ تو تب لگتا ہے جب طوفان تباہی و بربادی کرنے کے بعد خاموش

ہو جاتا ہے۔اور مجھے بھی اس کا احساس تب ہوا جب طوفان سر سے گزر جانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا اور میری زندگی کانٹوں کی سیج بن چکی تھی۔

تم نے میری زندگی کے صبر و قرار لوٹنے کے لئے مختلف حربے استعمال کیئے۔ایسے حربے جنہیں مَیں نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔مگر آج جب مَیں ان حربوں کے اثرات کا جائزہ لیتا ہوں تو جان پڑتا ہے کہ جس طرح تم نے میری زندگی کو تباہ کیا ہے اس طرح تو شاید ایٹم بم بھی نہیں کر سکتا تھا جس نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا تھا اور جس پر پابندی لگوانے کے لئے مَیں بھی امن اپیل پر دستخط حاصل کرنے کی غرض سے تمہاری دیدی کی کوٹھی پر پہنچا تھا۔گھر کے سبھی افراد نے بڑی خوشی سے اُس پر دستخط کر دئے کیونکہ وہ بھی دنیا کے دیگر نیک سیرت انسانوں کی طرح اس خطرناک ہتھیار پر پابندی لگوانے کے حق میں تھے مگر تم نے شرارتاً اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے تم اس سے پوری طرح متفق تھیں۔جب مَیں نے تم سے اس پر دستخط کرنے کے لئے کہا تو تم نے اپنی مسکراہٹ کا خطرناک حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا تھا......

"لیکن مَیں تو ایٹم پڑنے کے حق میں ہوں۔مَیں چاہتی ہوں کہ ایٹم بم ساری دنیا کو نیست و نابود کر دے۔" یہ کہہ کر تم پھر مسکرا پڑیں اور چند ثانیوں کے لئے مَیں سب کچھ بھول گیا۔بعد میں اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔"کیا آپ چاہتی ہیں کہ دنیا کے لاکھوں مظلوم انسان موت کے شکنجے میں جکڑ کر ہلاک کر دئے جائیں......؟ کیا آپ چاہتی ہیں کہ لاکھوں عورتیں اپنا سہاگ کھو بیٹھیں؟ لاتعداد بچے بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں؟ مائیں اپنے بیٹوں کی صورت دیکھنے کو ترستی رہیں؟ کیا آپ......"

تُم جیسے ضد پر اُتر آئی تھیں اس لئے بات کاٹ کر بولیں۔ "جی ہاں! مَیں یہ سب کچھ چاہتی ہوں۔ مَیں تباہی اور بربادی دیکھ کر خوش ہوتی ہوں مگر.........آپ کہیں تو مَیں اس پر دستخط کر سکتی ہوں۔"

تم تباہی و بربادی نہیں چاہتی تھیں کیونکہ تمہاری باتوں سے تصنع کی بو آرہی تھی۔ تمہارا مدعا تو صرف مجھ پر احسان جتا کر دستخط کرنے کا تھا۔ اور یہ میرے اصول کے خلاف تھا کہ کسی کو قائل کیے بغیر دستخط کرائے جائیں۔ مَیں نے آدھ گھنٹہ کی مسلسل بحث کے بعد تم سے دستخط حاصل کر لئے۔ مَیں جیت گیا تھا۔ دنیا ایٹم بموں کی ہلاک کن بارش سے بچ گئی تھی۔ لیکن مَیں تو جیتے جی مر گیا تھا کیونکہ اس بحث کے بعد تم میری علمیت کی قائل ہو گئی تھیں اور تم نے مصر کی حسین و جمیل عشوہ طراز ملکہ کلیوپیٹرا کی طرح مجھے اپنے دامِ محبت میں پھنسانا شروع کر دیا تھا۔ اور آخر حسن کے دروازے پر عشق کو جھکنا پڑا۔

مَیں جیت کر بھی ہار گیا تھا۔ تم ہار کر بھی جیت گئی تھیں۔

آج دو برس گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ مسرت بخش دن نہیں بھولے اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے مجھے تمہاری باتیں پہلے سے بھی زیادہ یاد آتی ہیں۔ تمہاری جدائی کا احساس بُری طرح ستاتا ہے۔ اور کبھی کبھی جب یہ تنہائی کاٹنے کو دوڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ اپنی زندہ لاش گھسیٹ کر سرینگر پہنچ جاؤں۔ اور جب تم میری اچانک آمد پر متحیر ہو کر مسکراہٹوں کی بوچھار شروع کر دو تو اپنا سر دیوانگی کے عالم میں تمہاری آغوش میں رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ اور جب تم میرے سر کو اُٹھا کر میرے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہو۔ "اجی آپ تو عورتوں کی طرح رونے لگے تو مَیں

سسکیاں بھرتے ہوئے کہوں "بے وفا تیری مسکراہٹوں نے میری خوشیاں لُوٹ لیں میری امیدوں کے قصر و کاخ مٹی میں ملا دیئے۔ مجھے محبت کا خار دار راستہ دکھا کر خود یہاں چلی آئیں اور اب جب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ زندگی کی آخری امید سینی ٹوریم میرے اس ہڈیوں کے ڈھانچے کو آخری دنوں میں پناہ دینے کے لئے اپنی طرف بُلا رہا ہے تو تم کہتی ہو کہ روؤں نہیں، ہنسوں؟ کیا یہ ہنسنے کا مقام ہے۔ مگر نہیں یہ سب کچھ اس زندگی میں ہونا دشوار ہے۔ علاوہ ازیں یہ سب کچھ کہنے کے لئے مَیں زندہ بھی نہیں رہوں گا۔ اور اس سے پہلے کہ تم میری صورت دیکھو، مَیں موت کی آغوش میں سو چکا ہوں گا۔ اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے...... بالکل عیاں۔

زیبی!

کیا تمہیں بھی ماضی کے وہ چند معمولی واقعات یاد ہیں؟ جنہوں نے مل کر ایک بہت بڑی ٹریجدی کی بنیاد رکھ دی۔ اس ٹریجڈی کا پیش خیمہ تمہاری سرینگر سے آمد تھی۔ تم چند ماہ کے لئے اپنی دیدی کے ہاں آئی تھیں اور اُس شام جب مَیں تمہاری دیدی کی کوٹھی پر پہنچا تو تمہارا حسین اجنبی چہرہ دیکھتے ہی مَیں کچھ جھجک سا گیا۔ تم نے مہذب لوگوں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ جس کا جواب دینا مَیں نے اخلاقی فرض سمجھا اور مَیں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر تمہیں نمستے کہا مگر...... نہ جانے آج میری قوتِ گویائی کو کیا ہوگیا تھا کیونکہ باوجود کوشش کے میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ اس سے تم یہ نہ سمجھو کہ مجھے کبھی کسی لڑکی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مَیں نے سینکڑوں کے مجمع میں تقریریں کی ہیں۔ پارٹی کی متعدد لڑکیوں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے اور آدھ درجن سے زائد لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھا چکا ہوں مگر تمہارے سامنے کئی

لمحے مجسمہ حیرت بنا کھڑا رہا۔ اور اُس دن کے بعد جب کبھی مَیں تمہاری دیدی کی کوٹھی پر گیا تو تم نے تبسموں کی بوچھار کے ساتھ میرا سواگت کیا۔

پہلے پہل مَیں نے تمہاری مسکراہٹوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ تم میرے لئے اُن عام لڑکیوں کی مانند تھیں جن سے میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس لئے مَیں نے تمہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مَیں ہفتہ میں ایک بار آتا اور گھر کے لوگوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے اپنی قیام گاہ پر واپس چلا جاتا۔ ہماری باتوں کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا تھا۔ سیاست سے لے کر پڑوس میں رہنے والے سردار جی کو موضوعِ سخن بنا لیا جاتا اور ہم لوگ رات کے گیارہ گیارہ بجے تک گپ شپ میں مشغول رہتے۔ کچھ دن تک تو تم ہماری گفتگو سنتی رہیں۔ پھر تم نے بھی ہماری گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ گفتگو کے دوران تم عموماً مجھ سے بحث میں اُلجھ جاتیں اور آخر تمہیں ہار ماننے ہی بنتی۔ اور شاید ان باتوں کا ہی اثر تھا کہ تم مجھ میں دلچسپی لینے لگیں حالانکہ مَیں کوئی زیادہ خوبصورت اور ڈیل ڈول والا نہیں بلکہ ایک عام نوجوان تھا۔ بلکہ مجھے ایک عام نوجوان کہنا بھی نوجوانوں کی ہتک کرنا تھا۔

بھلا تم ہی کہو۔ مجھ ایسے دُبلے پتلے شخص کو جس کی عمر بیس بائیس سال ہو جانے پر بھی پندرہ سولہ برس نظر آتی ہو۔ جس کا وزن ایک من دس سیر سے تجاوز نہ کرتا ہو، اُسے نوجوان کہنا کہاں تک درست ہے؟ مگر اس میں میرا بھی کیا قصور یہ قصور ہے اس نظام اور ماحول کا جس میں مَیں نے پرورش پائی تھی۔

جب مَیں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک عجیب دنیا میں پایا۔ میرے پتا چالیس پچاس روپے کے ایک معمولی کلرک تھے اور ہمارے مشترکہ

کنبے کے گیارہ افراد ہونے کی وجہ سے گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ جب مَیں اپنے مالدار پڑوسی کے بچے کو ننھی کار سے کھیلتے ہوئے دیکھتا تو میرا دل ان کھلونوں کے لئے مچل اُٹھتا۔ مَیں اپنی ماں کی گود میں بیٹھ کر ایسے ہی کھلونوں کے لئے ضد کرتا مگر میری ماں نے مجھے ٹھنڈی آہوں اور پیار کے سوا کچھ نہیں دیا۔

..........اور کچھ مدت بعد تنگ آ کر مَیں نے ماں سے اصرار کرنا بھی چھوڑ دیا۔ مَیں اپنے پڑوسی کے بچے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہتا اور ٹھنڈی آہیں بھر کر خاموش ہو جاتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں مجھے پیٹ بھر کر دودھ بھی نہیں ملتا تھا۔ جب تک مَیں ڈیڑھ سال کا تھا، اپنی ماں کے دودھ پر گزر کرتا رہا پھر......میرا ایک اور بھائی آ ٹپکا اور میرا حق چھین لیا گیا۔ مَیں روکھے سوکھے ٹکڑوں پر پلنے لگا۔ اُن دنوں کی جب یاد آتی ہے تو مَیں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ لوگ اپنے ماضی کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے اکثر بچوں کا بھی یہی حشر ہوتا رہا ہے جو میرا ہوتا رہا۔

ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا کہ تمہیں بھی شاید دوسری لڑکیوں کی طرح باتونی آدمی پسند تھے تبھی تو تم میری باتوں میں دلچسپی لینے لگیں حالانکہ مَیں معمولی شخصیت کا حامل تھا اور تم ایک پُرکشش اور حسین لڑکی۔

......ابھی مَیں محبت کے دوراہے پر شش و پنج کی حالت میں کھڑا اپنے مستقبل کے راستے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ تم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عشق کی وادیٔ پُرخار کی طرف لے چلیں اور مَیں اپنی زندگی کے مقاصد، اغراض اور نصب العین

بدل کر تمہارے ساتھ چل پڑا۔

مجھے تمہارے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یاد آج بھی بُری طرح ستاتی ہے جیسے تم میری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہو۔ مگر اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ تم تو واقعی میری زندگی کا حصہ تھیں۔ کبھی کبھی تو یہ اُحساس دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا کہ تم میرے لئے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ تمہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم اس جنم میں ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے جنم میں بھی (اگرچہ یہ میرا خیال خام ہے) ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن نامساعد حالات میں ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا۔ اور شاید یہی احساس تھا جس کی وجہ سے ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

ان ہی دنوں ہولی کا تہوار آ گیا۔ لوگ اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کو رنگین پانیوں اور گلال سے نیلے پیلے بھوت بنانے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے میں محو ہو گئے جسے دیکھو اسی کا حلیہ بگڑا ہوا نظر آتا تھا۔ میرے ساتھی بھی مجھے رنگوں اور گلال سے کارٹون بنانے کے لئے میرے گھر کے چکر کاٹنے لگے۔ اور چونکہ مجھے رنگ ڈالنے اور ڈلوانے سے کچھ نفرت سی ہے لہٰذا میں گھر سے بھاگ کر تمہاری دیدی کی کوٹھی میں پناہ لینے کے چل پڑا۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ وہاں قیامت میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس لئے جوں ہی مَیں نے سیڑھیوں کا موڑ کاٹا، تُم نے اُوپر سے سُرخ رنگ کی بالٹی مجھ پر انڈیل دی۔ اس تیزی کے ساتھ کہ مَیں اس گستاخی کے مرتکب کو دیکھ تک نہ سکا۔ اپنے کپڑوں کو سُرخ رنگ میں رنگا دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا۔ مَیں دل ہی دل مین پیچ وتاب کھانے لگا کہ تمہاری دیدی نے معذرت کے انداز میں کہا.........

”کاشی! مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہارے سفید کپڑوں کا زہبی نے ستیاناس کردیا۔“

اتنا سنتے ہی میرا غصہ ٹھنڈا سا پڑ گیا۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ تم میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں اور تمہاری مسکراہٹ نے میرے رہے سہے غصے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔ میرے دلؔ و دماغ میں رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور یہ تھی بھی حقیقت۔ تمہیں مجھ سے اُنس تھا...... عشق تھا...... محبت تھی۔ تم میری کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھیں۔ گردشِ ایام کے ساتھ ہی ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ مستقبل سے بے خبر۔ ان دنوں مَیں نے تمہیں آزمایا...... پرکھا...... اور میرے خیال کو تقویت ملی۔

ایک رات ہم سول لائن سے گھر کی طرف آرہے تھے تو تم نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا تھا۔ ”آپ سرینگر ضرور آیئے گا۔“

اور اگر مجھے دیکھ کر تم نے کوٹھی کا دروازہ بند کر دیا تو............؟“

مَیں نے مذاقاً کہا تھا مگر تم نے دُکھی ہو کر کہا۔ ”آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں؟ آخر آپ غیر تھوڑے ہی ہیں۔ کیا آپ کو میرا دل دکھا کر خوشی ہوتی ہے؟“

بھلا مَیں غیر نہیں تو اور کون تھا؟ مَیں تمہارا تو تمہارا تمہاری دیدی کا بھی دُور کا رشتہ دار نہیں تھا۔۔ ہم لوگ امرتسر میں صرف چند ماہ پڑوسی کی حیثیت سے رہے تھے۔ میری بھابھی اور تمہاری دیدی میں مراسم بڑھ گئے۔۔ تمہاری دیدی مجھے اپنے چھوٹے بھیا کی طرح چاہنے لگیں۔ آخر مَیں غیر نہیں تو اور کون تھا؟ مگر اُس دن تمہاری باتوں سے احساس ہوتا تھا جیسے ہم چند مہینوں سے ہی ایک دوسرے کو نہیں جانتے

بلکہ ایک طویل مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔اس جنم سے بھی پہلے سے۔ مَیں نے کئی بار سوچا کہ اپنے اس احساس کا اظہار تم سے کردوں کہ تمہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ہم اس جنم سے ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے جنم سے بھی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔مگر مَیں تم سے یہ نہ کہہ سکا۔کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اس بات کا تم پر جانے کیا اثر ہو۔اس لئے ہم کسی دوسرے موضوع پر باتیں کرتے کرتے تمہاری دیدی کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔تُم اندر چلی گئیں اور مَیں واپس اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

دوسرے دن تمہاری دیدی کے یہاں تقریب تھی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا مگر مَیں دیر سے پہنچا۔تمام مہمان کھانا شروع کر چکے تھے لہٰذا مَیں مجبوراً اندر بیٹھک میں ہی بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔نوکرانی چار پوریاں اور کچھ بھاجیاں رکھ کر چلی گئی۔مَیں نے پہلا نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ تم کمرے میں داخل ہوئیں۔مجھے اکیلا کمرے میں کھانا کھاتے دیکھ کر تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"آج آپ دیر سے کیوں آئے؟"

"ہماری پارٹی کی میٹنگ تھی۔"

"پارٹی...... پارٹی...... آپ کو تو پارٹی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔" پھر تُم میرے تھال میں پڑی ہوئی پوریوں کو ہاتھ لگا کر بولیں۔"اوہو۔آپ تو ٹھنڈی پوریاں کھا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟"

جی نہیں یہ مجھے دے دیجیے۔مَیں آپ کو اور گرم پوریاں لائے دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر تم پوریاں اُٹھا کر رسوئی کی جانب چل پڑیں۔مَیں کچھ ثانیے تک تمہیں دیکھتا

رہا۔ پھر مَیں نے تم سے پوچھا۔ ''مگران کا کیا کرو گی؟''

تم جاتے جاتے دروازے پر رُک گئیں۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ تمہارے لبوں پر کھیلنے لگی۔ ''انہیں مَیں خود کھالوں گی۔''

''جوٹھی؟''

''ہاں۔ جوٹھی''

مَیں کچھ کہہ نہ سکا اور تم جا کر رسوئی سے تین چار گرم پوریاں اُٹھالائیں، جن کے نوالے توڑتے ہوئے مَیں کسی دوسرے جہان میں کھویا رہا۔ مَیں سپنوں کے جال بُنتا رہا اور یہ سپنوں کے سلسلے اتنے لمبے اور وسیع ہوگئے کہ پارٹی آفس میں کام کرتے کرتے جب اچانک تمہاری یاد آجاتی تو میرا قلم لکھتے لکھتے رُک جاتا۔ نہ جانے کتنی دیر مَیں تمہارے تصور میں کھویا رہتا اور جب کوئی کامریڈ مجھے شانوں سے جھنجھوڑ کے کہتا۔ ''کامریڈ کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' تو مَیں ہڑ بڑا کر چونک پڑتا جیسے میرا راز طشت ازبام ہوگیا ہو۔ میری اس کمزوری کو بھانپے بغیر ہی کامریڈ بمل ازراہِ مذاق بول اُٹھتا ''کامریڈ! کہیں دل تو نہیں کھو بیٹھے؟ بمل کے اس مذاق پر تمام کامریڈ قہقہہ لگانے لگتے۔ لیکن اس اثنا میں بھی سنبھل چکا ہوتا اور منہ توڑ جواب دیتا۔ ''دِل ......دِل تو میں اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔'' میرے اس جوابی حملے کی تاب نہ لا کر تمام ساتھی خاموش ہو کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جاتے اور مَیں بھی اپنے بقیہ کام کو ختم کرنے کے لئے جلدی جلدی قلم چلانے لگتا۔ مگر اب تو قلم بھی اچھی طرح نہیں چلایا جاتا۔ کیونکہ کام کرتے وقت میری ناتواں انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ دِل بیٹھ جاتا ہے جیسے موت کا فرشتہ دہلیز پر کھڑا مجھے بُلا رہا ہو۔ جانتی ہو یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

صرف تمہارے اچانک سرینگر چلے جانے سے۔ کیونکہ تم نے خود ہی اس مسرت بخش اور طربیہ ڈرامے کو ٹریجڈی میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس دن تم سرینگر گئیں میری دنیائے دل ویران ہو کر رہ گئی۔ مَیں زندہ درگور ہو گیا۔

اُس دن جب مَیں تمہاری دیدی کی کوٹھی پر پہنچا تو ماحول ویران ویران اور انجانا سا نظر آیا۔ کوٹھی مَیں بالکل خاموشی تھی۔ صرف تمہاری دیدی اکیلی بیٹھی دال صاف کرنے میں منہمک تھیں۔ مَیں نے سوچا شاید تُم کسی کام کی غرض سے بازار وغیرہ گئی ہو اس لئے بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ لیکن مجھے ایک پل بھی چین نہ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ تمہاری دیدی سے تمہارے بارے میں پوچھوں۔ ابھی مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تمہاری دیدی نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔

''کاشی! کل رات زیبی سرینگر چلی گئی۔''

''سرینگر؟'' مَیں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''ہاں کل رات مہتہ صاحب دہلی سے پاسپورٹ بنوا کر آئے تھے۔ چونکہ انہوں نے کل ہر صورت سرینگر پہنچنا تھا اس لئے زیبی بھی اُن کے ہمراہ چلی گئی۔''

زیبی تُم چلی گئیں۔ ڈرامہ کامیڈی سے ٹریجڈی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ تمہارے چلے جانے کی منحوس خبر سے میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مَیں نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور آدھ گھنٹہ تک تمہاری دیدی سے معلوم نہیں کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ پھر مَیں اُٹھ کر پارٹی آفس کی طرف چل پڑا۔ جب پارٹی آفس پہنچا تو مجھے خاموش دیکھ کر کامریڈ بمل اپنی عادت بموجب مذاق کرنے لگا۔

''کہو کامریڈ! کہیں دِل تو نہیں کھو بیٹھے؟'' مگر آج مَیں اُس کے مذاق کا

جواب نہ دے سکا۔میں نے خاموشی کی حالت میں ہی الماری سے کاغذات نکالے تاکہ اپنی پریشانی وغم کو چھپا سکوں مگر باوجود ہزار کوشش کے چھپانے میں ناکام رہا......اوراب تو میرے اندرونی درد وکرب سے ہر کہ ومہ واقف ہو چکا ہے۔پارٹی کا کوئی فرد مجھ سے مذاق نہیں کرتا کیونکہ اب میں ایک زندہ لاش ہوں جسے ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم میں داخل ہونے کا مشورہ دے دیا ہے۔لیکن میں شاید سینی ٹوریم میں داخل نہیں ہوسکوں گا۔کون اتنا خرچ برداشت کرے گا؟ جبکہ دوائیوں اور دودھ قرض اور چندے کی صورت میں لینا پڑتا ہے۔اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ غریب انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں کے برابر ہوتا ہے۔سچ ہی تو ہے۔مگر تمہیں اس کا احساس کب ہوسکتا ہے؟ تم نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں جنم لیا۔تمہاری شادی کسی امیر نوجوان سے ہوجائے گی۔تمہاری شادی سے موت تک کا عرصہ خوشحالی اور مسرت کا دَور ہے۔اور میری زندگی؟ موت سے بھی بدتر۔اسی لئے تو میں جدوجہد کر رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک کنبے کا مفلس اور قلاش فرد ہوں۔میں زندگی میں جو کچھ سوچتا ہوں، وہ نہیں ہوسکتا۔میں انتہائی کوشش کے باوجود تمہارا نہیں ہوسکتا۔میرے اور تمہارے درمیان سینکڑوں یا ہزاروں میل کا فاصلہ نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں میل کا فاصلہ ہے۔سینکڑوں دیوارِ چین ہمارا راستہ روکے کھڑی ہیں۔اگرچہ میں ان دیواروں اور فاصلوں کو ایک ڈھونگ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن پھر بھی انتہائی کوشش کے باوجود میں انہیں سر نہیں کرسکتا۔یہ دیواریں اور فاصلے مذہب، ذات، برادری، امارت اور غربت کی شکل میں ہمارے راستے میں حائل ہیں۔اور میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس جنم میں

تمہارا نہیں ہو سکتا۔ ہاں مَیں سینی ٹوریم میں داخل ہونے کے بجائے اس جدوجہد کو جاری رکھوں گا...... آخری لمحہ تک۔ تا کہ ان دیواروں اور فاصلوں کو سر کر سکوں۔ اور جب مَیں موذی دق کے واروں کی تاب نہ لا کر مر جاؤں گا تو اس جدوجہد کو میرے دوسرے کروڑوں ساتھی جاری رکھیں گے اور ان کی ہمت اور مستحکم ارادگی ایک دن ان دیواروں کو تسخیر کر لے گی۔ اور مَیں مرنے کے بعد بھی جیت جاؤں گا۔ تب یہ احساس جو تمہیں دیکھ کر میرے من میں جاگ اُٹھتا تھا کہ اس سے پہلے جنم میں بھی ہم ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں، سچ ہوا تو پھر شاید اس سے اگلے جنم میں مَیں تمہارا ساتھی بنوں گا مگر یہ میری آخری جدوجہد ہوگی۔ اس وقت مذہب، ذات، برادری امارت اور غربت کی دیواروں کا نام ونشان نہیں ہوگا۔ دنیا ایک نئے نظام کی بنیاد رکھ چکی ہوگی جہاں ان باتوں کو ڈھونگ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی اور اُس نئے نظام کے دَور میں مَیں تمہارا ساتھی نہیں بلکہ جیون ساتھی بنوں گا۔

☆☆☆

طولِ شبِ فراق

کسی شکست خوردہ جواری کی طرح گردن جھکائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا وہ اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ اُس وقت وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین نظر آرہا تھا۔ اُس کے خشک اور منتشر بالوں نے اُس کا حلیہ مزید بگاڑ رکھا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا تمام اثاثہ لُٹا چکا ہو یا کسی دُور دراز واقع مرگھٹ سے اپنی کسی عزیز ترین ہستی کو نذر آتش کرنے کے بعد لوٹ رہا ہو۔ اُسے اس طرح مغموم اور اُداس دیکھ کر میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ چونکہ میں کافی دیر سے اُس کا انتظار کر رہا تھا اس لئے اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کی جانب چل پڑا۔ جب میں اُس کے قریب پہنچا تو پیچھے سے آواز دی۔

''ہاتو یاما!''

لیکن ہاتو یاما پر میری آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پہلے کی طرح ہی آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا

اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس پر میں دوبارہ چیخ اُٹھا۔

''ہاتو یاما!''

اِس بار اُس نے چونک کر پیچھے کی جانب دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی اُس کے پژمردہ اور غمگین چہرے پر خود بخود ہی پھیکی سی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور بولا۔

''ہیلو!'' کب آئے؟''

''مَیں تو تین گھنٹے سے ویٹنگ ہال میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''اوہ! معاف کرنا بھئی! مَیں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ دراصل مَیں بھول ہی گیا تھا کہ مَیں نے تمہیں کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔'' پھر وہ مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا چھا! چلو اندر کمرے میں چل کر بیٹھیں۔'' اُس نے یہ چند جملے اپنے مخصوص جاپانی لہجے والی انگریزی میں ادا کیے۔ اور پھر اپنی پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا اور مَیں اُس کے پریشان چہرے کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ جب سے اُس کی حسین وجواں بیوی ہیتی اور بچہ اوریا ناگاساکی میں ایٹم بم کی نذر ہوئے تھے تب سے اُس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ اکثر کھویا کھویا سا رہتا اور شراب اُس نے کثرت سے پینی شروع کر دی تھی اور وہ گھنٹوں غم والم کے بحرِ عمیق میں غرقاب رہتا۔ لیکن آج تو وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ اندر کمرے میں جا کر اُس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور کئی لمحے تک بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے لیٹا رہا اور مَیں اس عرصہ میں اُس کے چہرے کے تاثرات سے اُس کی اُداسی اور پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مَیں اُٹھ کر اُس کے پاس ہی پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا اور اُس کے منتشر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے ہاتویاما؟''

ہاتویاما نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ اُسی طرح دیوار کی طرف پیٹھ کئے بے حس وحرکت لیٹا رہا۔ آخراُس کی مسلسل خاموشی سے اوب کر مَیں نے اُس کا چہرہ اپنی طرف پھیرا تو دنگ رہ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو دجلہ وفرات کی مانند بہہ رہے تھے۔ مَیں نے اُس کی پُر نم آنکھوں اور چہرے کو صاف کرنے کے بعد ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاتویاما! تم اِتنے اُداس کیوں ہو؟''

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مَیں اُس کی غیر معمولی اُداسی سے دل ہی دل میں حیران وپریشان ہو رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کئی مرتبہ پہلے بھی کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اُداس ہو جاتا تھا اور اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے بیقرار ہو کر کسی انجانی دنیا میں کھو جاتا تھا مگر آج تو خلافِ معمول عام دنوں سے زیادہ اُداس اور نراش نظر آ رہا تھا۔ مَیں ابھی اپنا سوال دہرانا ہی چاہتا تھا کہ آہستہ آہستہ کھڑے ہو کر اُس نے الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی اور دو گلاسوں میں ڈال کر ایک میری جانب بڑھا دیا اور دوسرا گلاس اُٹھا کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔

مَیں تو یوں بھی کم پینے کا عادی ہوں لیکن آج اُس کی پریشانی نے مجھے اتنا فکر مند بنا دیا تھا کہ اُس کا ساتھ دینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا مگر جب اُس نے دو گلاسوں میں وہسکی ڈال کر ایک گلاس میری طرف بڑھایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی چُپ چاپ وہ گلاس اُس کے ہاتھوں سے تھام لیا اور اُس کا ساتھ دینے کے لئے دھیرے دھیرے چسکیاں بھرتے ہوئے تخیلات کی پرواز میں اُس اولین ملاقات کے منظر میں کھو گیا جب مَیں پہلی باراُس سے ملا تھا۔

ہاتو یاما سے میرے پہلی ملاقات فائن آرٹس گیلری میں ہوئی تھی جہاں مَیں عظیم روسی فنکار روریک کے قابل ستائش شاہکاروں کی نمائش دیکھنے میں منہمک تھا۔ جب مَیں دیوکا رانی کے پورٹریٹ کے پاس پہنچا تو اُس میں مجھے زندگی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور مَیں کئی لمحے مجسمہ، حیرت بنا اُس منہ بولتی تصویر کے سامنے کھڑا رہا۔ تبھی اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر میرا نام پکارا اور مَیں چونک سا پڑا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو میرا دیرینہ آرٹسٹ دوست راجن متل ایک جاپانی کے ساتھ کھڑا تھا۔

جب مَیں اُن کی طرف مُڑا تو راجن نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں میرے عزیز ترین بچپن کے ساتھی راکیش جنہیں مَیں راکی کہہ کر پکارتا ہوں۔ یہ ماڈرن آرٹ کے دلدادہ ہیں اور ان کی کئی تخلیقات عوام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔" اِس کے بعد اُس نے اجنبی جاپانی کا مجھ سے تعارف کرانا شروع کیا۔

"راکی! یہ جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ہاتو یاما ہیں۔ شاید تم نے آج کل ان کے بارے میں اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یہ یہاں بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔"

راجن کے تعارف کرانے پر مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ ابھی پرسوں ہی مَیں نے اخباروں میں اُس کے فوٹو کے ساتھ اُس کی آمد کی خبر بھی پڑھی تھی، مَیں نے فوراً ہی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی۔"

"اور مجھے بھی۔" اُس نے رسماً انگریزی میں جواب دیا۔

اس کے بعد ہم گیلری میں تصویریں دیکھنے میں منہمک ہو گئے۔ پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم تینوں ''گے لارڈ'' چلے گئے جہاں ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر جب ہم وہاں سے اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہونے لگے تو مجھے ہاتو یاما کے بارے میں کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔

سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر اُس نے بتایا تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں وہ نیو یارک میں تھا اور اُس کی رفیقۂ حیات ناگا ساکی میں۔ جب ہٹلر نے یورپ کے کئی ممالک کو تاخت و تاراج کر دیا تو اُس کی بیوی جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گھبرا گئی۔ اور اُسے جلد واپس آنے کے لئے لکھنے لگی۔ اُن دنوں ہوائی اور سمندری دونوں ہی راستے خطرناک تھے پھر بھی وہ اپنی جان پر کھیل کر نیو یارک سے ناگا ساکی پہنچ گیا کیونکہ اُسے اپنی بیوی سے انتہائی پیار تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے اکلوتے ننھے بچے کو دیکھنے کے لئے بھی بے تاب تھا جس کی پیدائش اُس کے نیو یارک پہنچنے کے چند ماہ بعد ہوئی تھی۔

ناگا ساکی پہنچ کر وہ خوشی خوشی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ زندگی گزارنے لگا...... لیکن پھر ایک دن اچانک ایٹم بم کے مہلک اور ہولناک دھماکے نے اُس کی دنیا اُجاڑ کر رکھ دی۔ اُس کی بیوی اور بچہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ وہ اُس قیامت خیز حادثے سے بچ تو گیا مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ سکون و چین کی تلاش میں تمام روئے زمین کا چکر لگانے لگا لیکن وہ اپنی عزیز بیوی اور لختِ جگر اوریا کو نہ بھلا سکا۔............ اور اب وہ بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لئے یہاں دہلی آیا ہوا تھا۔

آج سے پیشتر ایک بار کافی ہاؤس میں بھی جب وہ سگریٹ کے طویل کش کھینچ کر مرغولے بناتا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا تو مَیں نے اُس سے کہا تھا۔

''ہاتو یاما! اگر کہو تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں ہاں بڑے شوق سے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کروں؟ آخر چند ثانیے یسے ہی تذبذب کے عالم میں رہنے کے بعد مَیں نے سوال کیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بیوی اور بچے کی موت کیسے ہوئی؟'

وہ کچھ اُداس سا ہو گیا اور اُس کا اُداس چہرہ دیکھ کر مَیں خود ہی پچھتانے لگا کہ مَیں نے اُس سے ایسا سوال کیا ہی کیوں؟ یا تو ہاما کچھ دیر چپ چاپ تصویرِ غم بنا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر اُس نے اپنی جیب سے دوسرا سگریٹ نکالا اور اُسے سلگا کر کافی ہاؤس کی چھت پر ٹکٹکی جمائے بولا۔

''شاید تم جانتے ہی ہو گے کہ جاپان کو شکست دینے کے لئے اتحادیوں نے ایٹم بم کا سہارا لیا تھا اور اسی ایٹم بم نے ہیروشیما اور ناگا ساکی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ناگا ساکی پر بم پڑنے سے چند گھنٹے پیشتر میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ آہ اُس وقت کسے معلوم تھا کہ کل صبح ہونے سے پیشتر ہی موت کے ظالم ہاتھ اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔ رات ہم اطمینان سے سوئے۔ اچانک مجھے ایک زبردست دھماکا سنائی دیا اور اس سے پیشتر کہ مَیں آنکھ کھول کر حالات کا جائزہ لیتا، یک لخت مجھے اپنے اُوپر پہاڑ ایسا وزن گرنے کا احساس ہوا اور درد و کرب سے میری چیخ نکل گئی۔ لیکن اس کے بعد مجھے قطعی

ہوش نہیں رہا۔ اس واقعہ سے تیسرے دن جب مجھے ہوش آیا تو میں شدتِ درد سے بُری طرح تڑپ رہا تھا اور میرے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھ کھولنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر حالات کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میرے ارد گرد ڈاکٹروں کے علاوہ متعدد نرسیں بھی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ میں نے اُن سے متعدد سوال کیے مگر انہوں نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اُن سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور وہ اس دلدوز اور ہولناک حادثے سے از حد رنجیدہ اور اُداس نظر آتے تھے۔ کئی دنوں کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ ناگاساکی پر اتحادوں نے ایٹم بم گرایا تھا جس سے سارا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں، بچے یتیم ہو گئے تھے اور ماؤں کی گودیں سونی ہو گئی تھیں اور جو زندہ بچے تھے اُن میں زندگی کا کوئی لطف باقی نہ رہا تھا کیونکہ اُن میں سے کسی کی ٹانگ نہیں تھی تو کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کوئی اندھا ہو گیا تھا تو کسی کا چہرہ انتہائی ڈراؤنا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری بیوی اور بچہ بھی شاید دوسرے ہزارہا انسانوں کے ساتھ موت کا شکار ہو گئے تھے۔

وہ بات کرتے کرتے ایکا یکی خاموش ہو گیا۔ اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کئی لمحے وہ اسی طرح چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے پھر غمگین ہو گیا ہے۔ اُس کے ہاتھ کا ادھ جلا سگریٹ قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ پھر یکلخت وہ چونک پڑا اور اُس نے اپنی ادھوری داستان کا بقیہ حصہ سنانا شروع کیا۔

"........... ہیتی اور اوریا کی موت نے میرے لئے قیامت برپا کر دی

لیکن پھر بھی مجھے اُن کی موت کا یقین نہیں آتا تھا اس لئے رو بصحت ہوتے ہی میں نے اپنی زخمی ٹانگ کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی اُن کی تلاش شروع کر دی۔ ناگاساکی کے کھنڈرات اور ہسپتالوں کا چپہ چپہ مَیں نے ایک موہوم امید کے بھروسے چھان مارا اور آخر جب امید بھی دم توڑ گئی اور مجھے اُن کی موت کا یقین ہو گیا تو میں پاگل سا ہو گیا۔ دن بھر دیوانوں کی طرح ناگاساکی کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ناگاساکی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ آخر تنگ آکر مَیں نے ناگاساکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کبھی امریکہ چلا جاتا تو کبھی فرانس۔ مگر اس کے باوجود بھی مجھے سکون نصیب نہیں ہوا۔ مَیں جہاں بھی گیا اُن کی یاد میرا تعاقب کرتی رہی۔ اُن کی یاد مَیں ایک ثانیئے کے لئے بھی نہ بھلا سکا۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور اُس نے جیب سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے کش لگاتے ہوئے نہ جانے کون سی دنیا میں کھو گیا۔ مَیں بھی اُس کی اذیت ناک اور دلدوز داستانِ حیات سے غمگین ہو گیا تھا............ اتنا غمگین کہ اُس کے بعد مَیں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور چُپ چاپ بیٹھا اس کے اندرونی درد و کرب کے احساس سے دُکھ کے بحرِ عمیق میں غرقاب رہا۔ اُس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو ابھی اُسے اقوامِ متحدہ کے نمائندوں کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں اور اُن سے چیخ چیخ کر کہوں کہ.........

"اے امنِ عالم کے علم بردارو! کیا تُم دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو مہلک ایٹمی ہتھیار بنانے سے نہیں روکو گے؟ دیکھو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے

بموں کا نتیجہ۔ اس کی بیوی اور بچہ اُس قیامت خیز حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ اور یہ بالکل تنہا ہو کر آج ایک زندہ لاش بن چکا ہے۔ لیکن یہ صرف اس ایک واحد انسان کی داستانِ الم نہیں بلکہ یہ اُن لاکھوں انسانوں کی دکھ بھری کہانی ہے جنہیں ایٹم بم کا شکار ہونا پڑا ہے۔ جنہیں موت، بیماری، جسانی معذوریت اور اندرونی کرب سے دوچار کیا گیا ہے۔ کیا تم ان کی حفاظت نہیں کرو گے؟ کیا تم لاکھوں انسانوں کو اس غیر قدرتی موت اور بیماریوں سے نہیں بچاؤ گے؟ کیا تم ان گنت بچوں کے یتیم ہونے کے ذمہ دار نہیں ہو؟ بولو! جواب دو؟ کیا ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کبھی ختم نہیں ہو گی؟ کیا انسان کو آرام اور سکھ کی زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملے گا؟ بولو، جواب دو؟''

کافی دیر تک ہم اسی طرح ساکت وسامت بیٹھے رہے۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات چیت نہیں کی۔ وہ تو شاید اپنی پیاری بیوی اور بچے کی ابدی جُدائی سے دُکھی ہو کر اُن کے ساتھ گزارے ہوئے فرحت آمیز اور پُر مسرت دنوں کے تصور میں کھو گیا تھا اور مَیں اُس کی کہانی کے المیہ انجام سے ازحد غمگین ہو گیا تھا۔ اُس دن ہمیں پتہ ہی نہ لگا کہ کب ہم کافی ہاؤس سے اُٹھے اور کب ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

مَیں ابھی تک وہسکی کی چسکیاں بھرتے ہوئے ہاتو یاما کے ماضی کے بھیانک حادثے کے تصورات میں کھویا ہوا تھا۔ اور وہ گلاس پر گلاس بھر کر اپنے حلق میں انڈیلے جا رہا تھا حتا کہ پوری بوتل ختم ہو گئی اور اُس نے الماری سے دوسری بوتل نکال کر پینی شروع کر دی۔ اب شاید وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک میری نظر گھڑی پر پڑی، بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ مَیں فوراً گھر جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے

اُٹھتے دیکھ کر اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! بیٹھو نا! تم تو ابھی سے اُٹھنے لگے۔''

''نہیں۔ معاف کرنا ہاتو یاما مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر میں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔''

بیوی کے انتظار کی بات مَیں نے کہہ تو دی لیکن پھر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ مَیں نے یہ کہہ کر اچھا نہیں کیا کیونکہ وہ اس بات سے زیادہ غمگین ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔

''یار! معاف کرنا۔ تمہاری بیوی تمہارے انتظار میں پریشان ہو رہی ہو گی۔''

کچھ دیر بعد مَیں اُس سے ہاتھ ملا کر جلدی جلدی بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا مگر سارا راستہ مَیں نے ہاتو یاما کی اُداسی اور پریشانی پر غور کرتے ہوئے کاٹا اور رات سوتے وقت بھی اُس کا اُترا اور پژمردہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔

رات تاخیر سے سونے کے کارن صبح مَیں جلدی نہ اُٹھ سکا۔ جب آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی میرے اُٹھتے ہی نوکر بیڈ ٹی لے کر آوارد ہوا۔ چائے پیتے ہوئے مَیں نے سوچا کہ جلدی سے تیار ہو کر ہاتو یاما کی خیر و عافیت دریافت کرنے چلوں کیونکہ رات وہ شدتِ غم سے وِہسکی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ اتنے میں نوکر نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا تا کہ مَیں اپنی عادت بموجب خبریں سُن سکوں مگر پہلی خبر سنتے ہی چائے کا پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیوز ریڈر کہہ رہا تھا۔

"ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ہاتویاما نے خودکشی کر لی ہے۔ مرحوم ابھی چند ہفتے ہوئے بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ خودکشی کرنے سے پیشتر وہ ایک خط چھوڑ گئے ہیں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنی عزیز رفیقہ حیات ہیتی اور ننھے بچے اوریا کی ابدی فرقت گوارا نہیں کر سکتے جو ناگاساکی میں اتحادیوں کے ایٹم بم کا نشانہ بن گئے تھے۔ اُن کی یاد ہمیشہ اُن کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ اُن کے بغیر وہ ایک زندہ لاش ہیں اور اُن کی جدائی میں انہیں ایک پل بھی سکون نہیں ملتا اس لئے وہ اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آکر خودکشی کر رہے ہیں تا کہ.........

مَیں اس سے زیادہ کچھ نہ سُن سکا اور اسی طرح لباسِ شبانہ پہنے ہی ہوٹل پہنچنے کے لئے باہر کی طرف دوڑ پڑا۔

☆☆☆☆☆
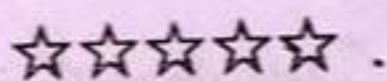
عجیب لڑکی

اور چار سال بعد اچانک ہی وہ مجھے لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر مل گئی۔ میں بک اسٹال پر کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ اُس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کامریڈ!''

ایک جانی پہچانی آواز سُن کر مَیں نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی چلا اُٹھا۔ ''کون...... کانتی؟''

اور کانتی نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہاں کانتی۔ کیوں یقین نہیں آرہا؟''

''نہیں یقین تو آرہا ہے۔ لیکن سوچ رہا ہوں کہ چار سال کے طویل عرصے کے بعد جب تم مجھے مل رہی ہو تب بھی تم میں اور پہلے والی کانتی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ وہی قہقہے...... وہی اندازِ گفتگو......''

''اچھا اچھا اب رہنے دو۔'' اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ''مَیں تو سمجھی تھی کہ اب تم نے باتیں کرنا کچھ کم کر دیا ہوگا لیکن تم تو اب بھی پہلے کی طرح باتونی ہو۔'' اور پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولی۔ ''سنو ہَمیں نے شادی کر لی ہے۔''

مَیں چونک پڑا۔ ''کیا تم نے شادی کر لی ہے کانتی! تم نے...... ایک جوگن

نے شادی کر لی ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا کانتی!۔"

"یہ حقیقت ہے کامریڈ! واقعی مَیں نے شادی کر لی ہے۔ اور وہ دیکھو میرے رفیقِ حیات..........."

وہ مجھے کھینچتی ہوئی ایک نازک اندام نوجوان کے پاس لے گئی اور میرا تعارف کرانے لگی۔"یہ ہیں میرے پتی ڈاکٹر ایس پی چاولہ اور یہ ہیں میرے کالج کے دوست...... کامریڈ، جن کا ذکر بار ہا مَیں نے آپ سے کیا ہے۔"

"ڈاکٹر چاولہ نے میرے ہاتھ کو پوری قوت سے دباتے ہوئے کہا۔"مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"اور مجھے بھی.........."مَیں نے بھی رسمی طور پر کہا حالانکہ مجھے اُن سے مل کر ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی اور اُس وقت میرے تخیلات کی دیوی اپنی نازک انگلیوں سے ماضی کے حسین چہرے سے نقاب اُلٹنے میں مصروف تھی اور مَیں چار سال پہلے کے واقعات میں کھویا ہوا تھا...........

"کامریڈ! بولتے کیوں نہیں؟ کیا سوچ رہے ہو؟" کانتی نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

میرے خیالوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ مَیں چونک اُٹھا۔"ایں کیا کہا تم نے؟"

"مَیں نے پوچھا تھا کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"مَیں...... مَیں سوچ رہا تھا کہ بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے مل کر انسان ماضی کی یادوں میں کیوں کھو جاتا ہے اور وہ یادیں بھی کتنی حسین اور پیاری ہوتی ہیں۔"

کانتی کا وہی مخصوص قہقہہ بلند ہوا۔ اس قہقہے نے ہمارے پاس کھڑے تمام

مسافروں کو ہماری طرف متوجہ کر دیا۔ وہ کئی لمحے قہقہے لگانے کے بعد بولی۔ ''تو کامریڈ اب تم فلسفی بھی بن گئے ہو؟''

''فلسفی' میں نے اپنے دل میں دہرایا جیسے اُس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر میرے ساتھ حقارت آمیز سلوک کیا ہو۔ لیکن وہ تو ایک صاف دل اور فرشتہ سیرت لڑکی تھی۔ گالی تو درکنار، اُس نے کبھی کسی کو ڈانٹا تک نہ تھا۔ وہ خوش اخلاق حسین اور پُرکشش ہونے کے علاوہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اُس کے والد ایک مشہور سماج سدھارک ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اور یہ اُن کی ہی تعلیم کا اثر تھا کہ اُن کی اولاد قابلِ رشک زندگی گزار رہی تھی۔ کانتی میرے ساتھ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ ہر طرح سے آزاد تھی، جہاں جانا چاہے جا سکتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ اُس نے آج تک سینما نہیں دیکھا تھا۔ مَیں نے کئی بار اُسے فلم دیکھنے کے لئے اصرار کیا مگر ہر بار اُس نے انکار کر دیا اور جواب دیا۔ ''کامریڈ! میرے پتا جی مجھ پر وشواس کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مَیں اس آزادی کا ناجائز فائدہ اُٹھاؤں اور سینما چلی جاؤں؟''

ایک بار پکنک کے دوران تمام لڑکے اور لڑکیوں نے گانے کا پروگرام بنایا مگر اُس پکنک میں بھی کانتی کا رنگ سب سے نرالا تھا کیونکہ جب تمام لڑکے اور لڑکیوں نے فلمی گیتوں سے مجلس کو گرمایا تو اُس نے کبیر کا بھجن گا کر محفل کا ماحول ہی بدل دیا جیسے وہ اس دنیا سے دُور کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہو یا وہ کوئی تارکِ دنیا ہو یا پھر کوئی جوگن جس کا دل اس فانی دنیا سے بھر گیا ہو۔ گانا ختم ہونے پر مَیں نے آہستہ سے کہا۔ ''جوگن''

اُس نے میرے طنز کی پروا کیے بنا جوب دیا۔ ''جی ہاں...... جوگن''

اور اُس کے انہی خیالات نے کالج بھر کو اُس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ پرنسپل، پروفیسر اور طلباء سبھی اُس کی شخصیت سے متاثر تھے۔ وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی۔ اس وجہ سے کئی طلبا اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ کانتی اُن سے محبت کرتی ہے۔ لیکن شاید اُسے اُن میں سے کسی سے بھی محبت نہیں تھی۔ ان ہی چاہنے والوں میں ایک پروفیسر پرکاش بھی تھے جو غیر شادی شدہ ہونے کے علاوہ کالج کے خوبصورت نوجوانوں میں سے تھے۔ کالج کی کئی لڑکیاں اُن پر جان دیتی تھیں لیکن وہ کانتی پر بُری طرح فریفتہ تھے۔ کانتی بھی کئی بار اُن کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھی گئی تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بھی پروفیسر پرکاش کو چاہتی ہے۔ اس وجہ سے کئی لڑکے تو پروفیسر پرکاش کو اپنا رقیب سمجھتے تھے، ایک باراُن کے ایک ہمراز استوڈنٹ اشوک نے اُن سے کہا تھا۔ ''پروفیسر صاحب! آپ بڑے خوش قسمت ہیں''

''کیوں؟''

''کیونکہ کانتی آپ کو چاہتی ہے۔''

''نہیں اشوک مَیں بھی اُن لڑکوں کی طرح بدقسمت ہوں جو اُس سے شادی اور محبت کرنے کے آرزومند ہیں۔ لیکن شاید کانتی سنگ دل ہے یا اُس کے سینے میں دل ہی نہیں۔ ایک بار مَیں نے اُس سے شادی کی التجا کی تھی۔ جسے سُن کر اُس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ''پروفیسر صاحب! مانا کہ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن مَیں آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ میرا شوہر...... شوہر ہی نہیں دیوتا بھی ہوگا جو مجھے کسی غیر مرد کے ساتھ بھی دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوگا، جو

مجھے گھر کی لونڈی نہیں سمجھے گا۔ جو اپنے حقوق کی ہی نہیں میرے حقوق کی بھی حفاظت کرے گا۔ اور جو سہی معنوں میں میرا جیون ساتھی ہوگا......اور پروفیسر صاحب! آپ میں یہ صفات کہاں؟ آپ تو کالج کے کسی لڑکے کے ساتھ بھی میرا باتیں کرنا پسند نہیں کرتے۔ اور پھر آپ مجھے عورت سمجھتے ہیں......اپنی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ۔ مَیں آپ سے شادی کیسے کرسکتی ہوں؟' اچانک پروفیسر پرکاش کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پھر وہ اپنے جذبات پر قابو پاکر کہنے لگے۔ ''کانتی ایک عجیب لڑکی ہے۔ جانے وہ کس سے پیار کرتی ہے؟ اور کس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟''

''عجیب لڑکی؟'' اشوک نے حیران ہوکر پوچھا۔

''ہاں۔ عجیب لڑکی۔''

اور پھر سارے کالج میں یہ بات پھیل گئی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی جُملہ تھا۔ ''کانتی عجیب لڑکی ہے۔''

''کانتی پروفیسر پرکاش کو نہیں چاہتی۔''

''کانتی کے سینے میں دل نہیں اور اگر ہے تو پتھر کا ٹکڑا۔''

''کانتی عجیب لڑکی ہے۔''

اور آج چار سال بعد جب وہ مجھے یہاں لکھنؤ اسٹیشن پر مل گئی تھی تو میری آنکھوں کے سامنے پروفیسر پرکاش کی بھیگی بھیگی آنکھیں گھوم رہی تھیں اور سامنے کانتی کے شوہر ڈاکٹر چاولہ قلی کے سر پر سامان رکھوا رہے تھے کیونکہ گاڑی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی پلیٹ فارم کی طرف آرہی تھی۔ گاڑی رکتے ہی ڈاکٹر چاولہ قلی کو لئے سیکنڈ کلاس

کے ڈبے کی طرف بڑھے اور میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

''کانتی! کیا پروفیسر پرکاش اب بھی گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے ہیں؟''

''پروفیسر پرکاش کون؟''

''میرے دل پر کاری چوٹ لگی۔ تو کیا عورت ماضی کو اپنے دل سے یکسر بھلا دیتی ہے؟ اور شاید میرے ساتھ تاج کی سیر کو بھی کانتی بھول گئی ہوگی؟

''اوہ! تو تم پروفیسر پرکاش کو بھول گئی ہو؟ وہی جو ہمیں اکنامکس پڑھایا کرتے تھے۔''

''اچھا، اچھا۔ وہی جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''ہاں وہی''

''وہ تو کب کے کسی اور جگہ چلے گئے۔ اور مجھے تو اُن سے سخت نفرت تھی کیونکہ وہ شریف آدمی نہیں تھے۔''

''تو شاید تم تاج میں گزاری اُس رات کو بھی بھول گئی ہوگی؟'' میرے دل میں لاوا کھول اُٹھا۔

''نہیں تاج کی وہ رات تو مَیں بھلائے سے بھی نہیں بھلا سکوں گی کیونکہ وہ میری زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ اگر مَیں نے اپنے شوہر کے بعد کسی کو چاہا ہے تو وہ تم ہو۔ تم کامریڈ!......تم''

میرا سر فخر سے تن گیا کیونکہ کانتی مجھے چاہتی تھی اور اب بھی میرے لئے اپنے دل میں کچھ جگہ رکھتی تھی۔ مجھے ماضی کے اُن خوبصورت لمحات کی یاد آ گئی جب وہ اور مَیں شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبت کی یادگار تاج محل دیکھنے آگرہ گئے تھے۔

پورنماشی کی رات تھی۔ چاند کی کرنوں سے تاج سنہری دکھائی دے رہا تھا۔ مَیں اور کانتی تاج کے ایک گوشے میں جذبات کے ہجوم میں گھرے اُس غیر فانی محبت کی یاد میں کھوئے ہوئے تھے۔ کئی گھنٹے ہم نے ایسی ہی حالت میں گزار دئے اور پھر اچانک مَیں نے کانتی سے پوچھا۔

''کانتی! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

''ہاں کامریڈ! لیکن......

''لیکن کیا؟''

''کیا تم کمیونسٹ پارٹی چھوڑ سکتے ہو؟''

مَیں چیخ اُٹھا۔ ''نہیں یہ میرے لئے ممکن نہیں۔''

''تو پھر مَیں بھی تم سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''مگر سنو تو۔''

''مَیں کچھ سننا نہیں چاہتی۔''

اور معمول کی طرح اُس نے مجھے بحث کا موقع بھی نہ دیا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار اُس نے پارٹی سے نفرت کا اظہار کیا تھا اور ہر بار مَیں نے اُس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اُس نے بحث کا موقع نہیں دیا تھا اور اُس کی نفرت نفرت ہی رہی۔ اور اُس دن اُس کی باتوں نے میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا۔ آگرہ سے لوٹتے ہوئے ہم دونوں خاموش تھے اور گاڑی فراٹے بھرتی لدھیانہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور ہم ساکت وصامت بیٹھے رات کے المیے کا کوئی حل ڈھونڈ رہے تھے۔ جب کوئی حل نہ نکلا تو مَیں نے تنگ آ کر لدھیانہ کو خیر باد کہہ دیا اور لکھنؤ میں سکونت اختیار

کر لی اور اُسے بھولنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ مگر اُس حادثے کو بھی ابھی بھلا بھی نہ پایا تھا کہ آج وہ اچانک لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر مل گئی تھی۔

گاڑی کا سگنل ہو چکا تھا۔ انجن کی سیٹی کے ساتھ ہی ڈاکٹر چاولہ کی آواز بھی میرے کانوں کو چیرنے لگی۔ ''کانتی سگنل ہو چکا ہے۔''

کانتی نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا کامریڈ! خدا حافظ!''

میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے میرے ماضی کے حسن لمحات کا ساتھی ......میرا سب کچھ......مجھ سے دور جا رہا تھا۔

وہ گاڑی میں سوار ہو چکی تھی اور گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اور کئی لمحے کانتی کا رومال ہلتا دکھائی دیتا رہا۔ اور جب گاڑی ایک نقطہ بن کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو میں پاگلوں کی طرح بڑبڑا اُٹھا۔ ''عجیب لڑکی''

اور پلیٹ فارم پر کھڑے کئی مسافر جو شاید میری اور کانتی کی باتوں میں دلچسپی لے رہے تھے، حیرانی سے مجھے گھورنے لگے۔

☆☆☆☆☆

کابلی والا کی واپسی

(گورو دیو ٹیگور کی روح سے معافی کے ساتھ)

مَیں حشمت خان کے اچانک غائب ہو جانے سے سخت پریشان تھا۔ معلوم نہیں وہ کہیں چلا گیا تھا یا کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھی اُس کا اتہ پتہ نہیں مل رہا تھا۔ فکر کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو مجھے ملنے ضرور آتا کیونکہ وہ دو تین دن کے وقفے کے بعد مجھے ملنے آ جایا کرتا تھا اور اگر بالفرض کسی وجہ سے نہ آپاتا تو ٹیلی فون پر ہی بات چیت کر لیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں مَیں نے اُس کے کئی ساتھیوں سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کوئی اُس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میری چِنتا بڑھتی جا رہی تھی...... بڑھتی جا رہی تھی۔

میرا آبائی وطن بنگال ہے جہاں کے مسحور کن نغمے اور حسیناؤں کی سیاہ لمبی زلفیں لوگوں پر جادو کر دیتی ہیں اور شاید اسی وجہ سے بنگال کا جادو بھی مشہور ہے۔۔ لیکن شاید آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میری دادی کو ضرور جانتے ہوں گے۔ اُن کے پتا بنگال کے بہت بڑے لیکھک تھے، وہی جنہوں نے کابل کے رہنے والے رحمت کے بارے میں ایک کہانی ''کابلی والا'' لکھی تھی اور جسے میری دادی یعنی مُنی سے بہت اُنس و لگاؤ تھا اور وہ جب بھی اُن کے گھر آتا تھا تو اُن کے لئے خاص طور پر کشمش

بادام، اخروٹ، پستہ اور دوسرے خشک میوے لایا کرتا تھا۔ تب دادی بہت چھوٹی تھیں اور وہ گڑیا اور گڈے کی شادی ایسے کھیلوں میں منہمک رہتی تھیں۔

آپ نے وہ کہانی پڑھی ہے یا نہیں لیکن اس کہانی پر مبنی فلم تو ضرور دیکھی ہوگی؟ خیر چھوڑیئے اُس لمبے قصے کو۔ اب تو اس قصے کو بیتے بھی لگ بھگ پون صدی گزر چکی ہے۔ مگر میں نے یہ کہانی کئی بار پڑھی ہی نہیں اپنی دادی کی زبانی بھی سنی ہے جسے سناتے سناتے اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اب تو اُن کا انتقال ہوئے بھی عرصہ بیت چکا ہے لیکن مجھے اس بات پر انتہائی فخر ہے کہ میں اُس دادی کا پوتا ہوں جو کابلی والا کی ہیروئن تھیں اور جو کابلی والا کے آنے کا بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھیں۔ حالانکہ ایک وقت تھا جب وہ اُس سے بہت ڈرتی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ میلے کچیلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے سر پر پگڑی باندھے، پیٹھ پر جھولی اور ہاتھوں میں انگوروں کے دو چار بکس اُٹھائے سڑکوں اور گلیوں میں گھومنے والے کابلی والا کی جھولی میں ننھے منے بچے ہوتے ہیں جنہیں وہ چوری چھپے اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اُس کا ڈر ختم ہو گیا اور دونوں کی خوب دوستی ہو گئی۔

شادی کے بعد میری دادی کلکتہ سے دہلی آکر تیمار پور میں بنے ایک سرکاری کوارٹر میں رہنے لگیں کیونکہ میرے دادا کیلاش واسن سکریٹریٹ میں ایک اچھے عہدے پر مامور تھے۔ کئی برس تک وہ تیمار پور میں بنے سرکاری کوارٹروں میں رہنے کے بعد سنٹرل سکریٹریٹ کے نزدیک گول مارکیٹ میں اپنا نجی مکان بنا کر رہنے لگے اور جب میرے والد کی شادی ہوئی تو پریوار بہت بڑھ گیا تھا لہذا میرے والد نے چترنجن پارک میں ایک پلاٹ لے کر وہاں اپنا مکان بنا لیا۔ میری پرورش و پرداخت

وہیں ہوئی تھی اور یہاں امریکہ آنے سے پیشتر میں چترنجن پارک میں ہی رہا کرتا تھا۔

لیکن میں تو حشمت کی بات کر رہا تھا اور حشمت کا کابلی والے سے کیا رشتہ تھا جو مَیں اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھ رہا ہوں؟

دراصل مَیں نے رحمت کابلی والا کی کہانی اتنی بار پڑھی اور سنی تھی کہ مجھے افغانستان اور وہاں کے باشندوں سے جذباتی لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ جب مَیں دہلی میں تھا تب بھی اگر مجھے کوئی پٹھان نظر آ جاتا تو مَیں اُس سے اُس کے اور اُس کے ملک کے بارے میں جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ایک دن جب کار خراب ہونے کی وجہ سے مَیں ٹیکسی ہائر کر کے کارٹریٹ سے مین ہٹن کی جانب جا رہا تھا تو اتفاق سے اُس کیب کا ڈرائیور بھی ایک پینتیس چالیس سال کا پٹھان نکلا۔ یہ اندازہ میں نے اُس کے ڈیل ڈول اور شکل و صورت لگایا تھا لیکن پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پاکستان کے صوبہ سرحد کا رہنے والا ہے یا افغانستان کا لہٰذا مَیں نے اس کی تحقیق کی غرض سے پوچھا۔

''خان صاحب! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔''

میرے سوال پر وہ چونک اُٹھا کیونکہ عام طور پر اس طرح کے سوال امریکہ میں پوچھنے کا رواج نہیں، لوگ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ شاید اسی کارن اس سوال پر اُسے حیرت سی ہو رہی تھی۔ وہ کچھ ثانئے تو جواب بھی نہیں دے پایا۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بنا پیچھے دیکھے ہی جواب دیا۔ ''جناب مَیں کابل کا رہنے والا ہوں۔''

کابل کا ذکر سُن کر پھر مجھے رحمت کی یاد آ گئی۔ اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''واہ! کابل؟ کیا خوبصورت جگہ ہے'' اتنی خوبصورت جگہ چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''صاحب۔ آدمی کو روزی کے لئے کہاں کہاں بھٹکنا نہیں پڑتا؟ میرے دادا پیسہ کمانے کے چکر میں ہندوستان کے شہر کلکتہ جایا کرتے تھے اور اب وقت بدل چکا ہے صاحب! آج ہم لوگ پیسہ کمانے کے چکر میں امریکہ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' پھر مَیں نے اُس سے پوچھا۔ '' کیا تم نے ہندوستان دیکھا ہے۔''

حشمت نے آہ بھری اور کہا۔ '' صاحب کچھ نہ پوچھئے بڑی دردناک کہانی ہے۔''

''اوہ'میں نے اظہار افسوس کیا اور استفسارانہ انداز میں پوچھا۔ '' کیا وہاں تمہارے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہو گئی تھی؟''

''نہیں صاحب...... دراصل مَیں خان حبیب اللہ صاحب کی فوج میں ملازم تھا۔ جب کابل کے چوک میں انہیں سر بازار پھانسی دیدی گئی تو مَیں اور میرے کئی ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مَیں بھاگ کر چھپتا چھپاتا پشاور پہنچ گیا اور پھر وہاں سے ہندوستان۔ کچھ دن تو مَیں امرتسر میں کابل کے ایک بیوپاری جسونت سنگھ میوہ فروش کے گھر پر مہمان رہا جو کابل میں ہمارا پڑوسی تھا۔ بعد ازاں دہلی آ کر اقوام متحدہ کے پناہ گزین کی حیثیت سے رہنے لگا ...... بعد میں موقع ملنے پر یہاں امریکہ آ گیا۔'' پھر اُس نے بنا پیچھے دیکھے سوال کیا۔ '' صاحب! کیا آپ نے کابل دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ لیکن مجھے دیکھنے کی خواہش ضرور ہے؟''

''کیوں؟ آپ کو کابل میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُسے اپنی دلچسپی کی وجہ کیسے بتاؤں۔ میں چند ثانئے چُپ ہو گیا اور پھر گویا ہوا۔ ''دراصل میری دادی کلکتہ کی رہنے والی تھیں۔ جب وہ کمسن تھیں تو اُن دنوں رحمت خان نامی ایک پٹھان وہاں آیا کرتا تھا۔ اور اُنسے میری دادی سے بہت پیار ہو گیا تھا ا اور وہ ہمیشہ اُن کے لئے میوے لایا کرتا تھا۔''

''صاحب رحمت خان تو میرے دادا کا نام ہے۔ وہ بھی کلکتہ میں ہی بیوپار کرتے تھے۔ بچپن میں ایک بار انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ایک بار اُن کا ایک بنگالی سے اس بات پر جھگڑا ہو گیا تھا کہ وہ اُن کا ادھار چکانے سے مکر گیا تھا۔ اس پر انہوں نے مار پیٹ کی اور انہیں سزا ہو گئی تھی۔

''ہاں ہاں وہی رحمت۔ وہی تو میری دادی سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جیل سے چھوٹتے ہی وہ دوسرے دِن میری دادی سے سے ملنے آئے تھے مگر تب اُن کی شادی کے لئے منڈپ تانا جا رہا تھا اور اس مبارک موقع پر نانا نے رحمت کو کسی دوسرے دن آنے پر ٹال دیا مگر رحمت چاہتے تھے کہ وہ ایک بار منی یعنی میری دادی کو دیکھ لیں مگر میرے بڑے نانا نہیں مانے تب مجبوراً رحمت خان نے بہ عالمِ مجبوری واپس جانے کا ارادہ کیا اور جانے سے پہلے اُنہوں نے نانا جی کو ایک پوٹلی پکڑائی جس میں انگور اور تھوڑا سا کشمش اور بادام تھے۔ وہ چاہتا تھے کہ یہ سوکھا میوہ مُنی کو دیا جائے۔ نانا جی میوہ دیکھ کر پسیج گئے اور انہوں اُنہیں میوے کی قیمت دینے کے لئے کچھ پیسے نکالنے چاہے تو انہوں نے جو بات کہی اُس نے نانا جی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

تمہارے دادا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ آپ کی بڑی مہربانی بابو صاحب۔ دراصل جس طرح آپ کی یہ بیٹی منی ہے اسی طرح کابل میں میری بھی ایک بیٹی ہے میں اُسی کا چہرہ یاد کر کے منی کے لئے یہ میوہ لایا ہوں، سودا کرنے نہیں۔

یہ واقعہ سُن کر حشمت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں دادا نے مجھے یہ بات بھی بتائی تھی'' پھر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔'' صاحب! آپ اُن کے بارے میں اور کیا جانتے ہیں۔''

'' حشمت خان! میں تمہارے دادا کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں کیونکہ میرے بڑے نانا بنگال کے بہت بڑے لیکھک تھے۔ انہوں نے تمہارے دادا کی پوری کہانی بڑی تفصیل سے '' کابلی والا'' کے نام سے لکھی تھی۔ اور پھر میری دادی نے بھی مجھے کئی بار وہ واقعات سنائے ہیں اس لئے مجھے اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔

'' اچھا''

'' ہاں شاید تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے دادا حشمت خان نے پیسے لینے سے انکار کرنے کے بعد اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے سے ایک میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر بڑے نانا کو دکھایا تھا، جو کوئی فوٹو گراف نہیں تھا، کوئی آئیل پینٹنگ نہیں تھی، کوئی اعلیٰ شاہکار نہیں تھا بلکہ اُن کی بیٹی کے ننھے ہاتھ کی چھاپ تھی جو ہاتھ پر تھوڑی سی سیاہی لگا کر لے لی گئی تھی۔ تب گھر والوں کے اعتراض کے باوجود انہوں نے لال چولی اور ماتھے پر چندن لگائے دلہن کے روپ میں شرماتی لجاتی مُنی کو اندر سے بلا کر تمہارے دادا سے ملوایا تھا۔''

ان ہی باتوں میں ہم 'مین ہٹن' پہنچ گئے۔ اور مَیں نے اُتر کر ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لئے پرس کھولا لیکن اُس نے ٹیکسی سے اُتر کر میرا بازو پکڑ لیا۔ نہیں صاحب! آپ ہمارے بھائی ہیں۔ بھلا ہم آپ سے پیسے کیسے لے سکتے ہیں؟" مَیں نے بہت کوشش کی کہ وہ کرایہ لے لے مگر بہت اصرار کے باوجود بھی اُس نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح برسوں پرانے جذباتی رشتوں کی تجدید ہو گئی...... اور ہم لوگ اکثر ملنے لگے۔

ہماری گفتگو زیادہ تر موجودہ دور کی بے حسی اور ماضی کے کلکتہ اور کابل کے اِرد گرد گھومتی تھی جب انسانی قدروں کی تعظیم تھی، لوگ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ اور کسی طرح کی مذہبی منافرت کا نام و نشان نہ تھا۔

کچھ ملاقاتوں کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ حشمت کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے اور یہ کہ وہ بڑا دیندار اور متقی شخص ہے اور روزے نماز کا انتہائی پابند۔ وہ ہر مرض کا علاج نماز میں ہی ڈھونڈتا تھا اور ہر واقعہ کو خدا کی مرضی کہہ کر صبر کر لیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ کہنے لگا۔ "اللہ کی مرضی کے سامنے انسان کتنا مجبور ہے۔ ہم اس کی رضا کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اب دیکھئے نا میرے دادا کو کلکتے میں قید و بند کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اُن سے ایک شخص نے رام پوری چادر اُدھار لی تھی اور بعد میں روپے مانگنے پر اُس نے جھوٹ بول کر روپے دینے سے انکار کر دیا تھا اور انہیں بھدی بھدی گالیاں دی تھیں۔ کیا اپنے پیسے مانگنا جرم ہے؟ کیا کوئی گالی دے تو خاموش ہو جانا چاہیے؟ میرے دادا بھی تو گالیاں سُن کر غصے میں آ گئے تھے اور اپنے چاقو سے اُسے زخمی کر دیا تھا۔ اور عدالت سے انہیں جان لیوا حملہ

کرنے کے جرم میں کچھ برس کی سزا ہوگئی تھی۔ حالانکہ حقیقتاً اس میں قصوروار وہ شخص تھا جوادھار دینے سے مکر گیا تھا اور مانگنے پر گالیاں دیتا تھا۔ مگر شاید اس میں اللہ کی مرضی تھی۔''

ہر بڑے سے بڑے المیہ پر اُس کا اللہ کی مرضی کہنا کبھی کبھی مجھے بہت کھلتا تھا۔ حتا کہ جب ٹریڈ سینٹر کے ٹاور کو دہشت گردوں نے اُڑا دیا تو اُن دنوں بھی وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت نماز پڑھنے میں ہی لگاتا تھا۔ اُس نے اس اتنے بڑے واقعہ پر صرف ایک ہی فقرہ کہا تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے''۔ حالانکہ دہشت گردی کے اتنے بڑے واقعہ سے یہ شہر ہی نہیں ساری دنیا لرز اُٹھی تھی اور لوگ ہر وقت اور ہر لمحہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے ایک ایک منٹ کی خبر بڑی بے چینی اور بے تابی سے سنتے نیز اخبارات میں بھی اُس سے متعلق ہر خبر کو بڑے غور و انہماک سے پڑھتے اور دل ہی دل میں دہشت گردوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے یا آپس میں بیٹھ کر اسی پر تبصرہ کیا کرتے رہتے تھے۔ مگر حشمت کا ایک ہی جواب تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے۔'' یہاں تک کہ جب امریکہ نے طالبان کے خاتمے اور اسامہ بن لادن کی گرفتاری کی غرض سے افغانستان کے شہروں پر بمباری شروع کردی اور شہر کھنڈروں میں تبدیل ہوگئے اور وہاں کے عوام کے بدن کلسٹر بموں سے چھلنی ہوجانے سے اُن کی رگ رگ میں بارود کی بو سما گئی کہ وہ سانس بھی لیتے تھے تو اُن سے بارود کی بو ہی باہر نکلتی تھی تب بھی وہ بڑی سنجیدگی سے یہی کہا کرتا تھا ''سب اللہ کی مرضی ہے''

اُس کی یہ بات سُن کر کئی بار میرا تو صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا اور جی چاہتا کہ اُس سے پوچھوں کہ کیا خدا کی یہی مرضی ہے کہ افغانستان کے بے قصور اور معصوم افراد

امریکہ کی کی منظم دہشت گردی کا شکار ہو کر ہزاروں کی تعداد میں لقمہء اجل ہو جائیں؟ لیکن اُس کی سنجیدگی نے مجھے ایسا کہنے سے ہمیشہ روکا۔ اور پھر جب عراق میں صدر صدام کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے امریکی فوجیوں نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی اور وہاں کی تہذیب و تمدن کو نیست و نابود کرنے میں چنگیز و ہلاکو کے ریکارڈ توڑ دئے تو اُن دنوں معلوم نہیں کیا ہوا کہ اُس کا آنا جانا یک لخت بند سا ہو گیا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ حشمت کہاں غائب ہو گیا ہے۔ میں نے اُس کے کئی ساتھیوں سے بھی پوچھا مگر اُس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ ملا۔ گھر پر بھی ٹیلی فون کرنے پر آنسر مشین سے یہی جواب ملا۔ "وہ فی الحال گھر پر نہیں، ازراہ کرم اپنا پیغام چھوڑ دیں"

مَیں حشمت کے یوں غائب ہو جانے سے بے حد پریشان تھا کہ ایک دن اچانک صبح ہی صبح کسی نے کال بیل بجائی۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے حشمت کھڑا تھا۔ اُس کی شکل و صورت دیکھ کر حیرت و استعجاب سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ جیسے وہ صدیوں سے بیمار ہو۔ چہرے پر جھریاں یوں اُبھر آئی تھیں جیسے کسی بڑے جنکشن پر پھیلی ٹیڑھی میڑھی ریل کی لائنیں۔ اُس کا سرخ گورا چہرہ بھی اب کچھ تنبئی رنگ کا نظر آتا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں کی چمک بھی مدھم پڑ چکی تھی۔ یہی نہیں اُس کا لمبا تڑنگا جسم بھی کچھ جھکا جھکا سا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ تھک سا گیا ہو یا کسی گہرے غم و فکر نے اُسے توڑ کر رکھ دیا ہو۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا حشمت بھائی! اتنے دن کہاں تھے؟"

وہ میرے پاس ہی صوفے پر دھیرے سے بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ

انتہائی تھکا ہوا ہے۔ مَیں نے اُٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا تا کہ پانی پی کر اس کے حواس کچھ درست ہوں۔ پانی پینے کے بعد اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''صاحب۔ کیا بتاؤں۔ ایک رات مَیں ٹیکسی پر گھر واپس آ رہا تھا کہ یکلخت پولیس نے راستے میں میری گاڑی روک لی اور مجھ سے کئی طرح کے سوال پوچھنے لگے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تم اسامہ بن لادن کو جانتے ہو؟ افغانستان میں تم کہاں رہتے تھے؟۔ پھر وہ مجھے پولیس اسٹیشن لے گئے اور بالآخر مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ مَیں آج ہی وہاں سے رہا ہو کر آیا ہوں اور اب دو دن بعد مَیں واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔

''اپنے ملک؟ افغانستان......؟''

''جی ہاں''

''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ مجھے تین دن کے اندر اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم ہوا ہے اور شاید یہی اللہ کی مرضی ہے۔ ویسے بھی اب یہ ملک اس قابل نہیں رہا کہ مسلمان یہاں رہے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ کسی شخص کے نام کے ساتھ محمد، احمد، حسن اور حسین دیکھ کر ہی اُسے کسٹم والے ہوائی اڈے پر روک لیتے ہیں اور اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے ہیں۔ انہیں ہر مسلمان دہشت گرد ہی نظر آتا ہے۔ اور انہیں اتنا ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے کہ خدا کی پناہ......

اُس کی باتیں سُن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا کہ اتنے برس امریکہ میں رہ کر بھی

اُسے بنا کسی قصور کے دیش نکالا مل رہا ہے۔ میں کچھ دیر اس کی دلی کیفیت پر غور کرتا رہا اور چاہتا تھا کہ اس سے کوئی سوال کروں کہ وہ بول اٹھا۔

''میرے اس دیس نکالے میں شاید اللہ کی مرضی شامل ہے۔ شاید اللہ چاہتا ہے کہ مَیں اپنے ملک جا کر ودیشی طاقتوں کو ختم کرنے کی دوسرے حب الوطنوں کے ساتھ مل کر جنگ شروع کروں۔ آج امریکہ نے اقوام متحدہ کے ریزلیوشنوں کو ٹھکرا کر عراق میں جو دھاندلی کی ہے، وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ اسی طرح افغانستان کی بھی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان لوگوں نے طالبان اور اسامہ بن لادن کو ختم کرنے کے بہانے اپنی من پسند سرکار ہم پر تسلط کر دی ہے۔ اور میرے دیش کو امریکی اڈے میں تبدل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس لئے میں وہاں جا کر ان بدیشی طاقتوں کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اتنا کہنے کے بعد وہ یک لخت کھڑا ہو گیا اور رخصت ہونے کے لئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلچھلا رہے تھے اور اُس کے قدم من من کے بھاری ہو گئے تھے۔

وہ مجھے الوداع کہہ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا شام کے اندھیرے میں کھو گیا۔ لیکن اُس کے جانے کے بعد بھی مَیں کئی لمحے دروازے پر کھڑا یہی سوچتا رہا کہ کیا رحمت اور حشمت کو ہمیشہ ہی ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی رہے گی؟؟؟

☆☆☆☆☆

کا گا سب تن کھائیو.....

اگر وہ اپنے ملک کی سرحد پر تعینات فوجی ہوتے تو شاید کسی بہانے کی آڑ لے کر ایک دوسرے پر اندھا دھند گولیاں چلا کر اپنی وطن پرستی کا ثبوت دیتے اور اگر وہ اپنے ملک کے سیاست داں ہوتے تو اپنے ملک کے عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ نہ تو اپنے ملک کی سرحد پر تعینات فوجی تھے اور نہ ہی ملک کے سیاست داں بلکہ دو غیر ملکی ایشین تھے جو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ڈان ملز پر واقع ایک کئی منزلہ عمارت کی مختلف منزلوں پر رہتے تھے۔ لیکن یہاں اُن دونوں کو اتفاق سے ملنے پر ذرا بھی احساس نہ ہوا تھا کہ وہ ہندوستانی ہیں یا پاکستانی۔ بلکہ انہیں ایسا احساس ہوا جیسے وہ ایک ہوں۔ ایک ہی جگہ...... ایک ہی خطہ اور ایک ہی شہر کے رہنے والے ہوں۔ اُن میں کوئی فرق نہیں تھا کوئی امتیاز نہیں تھا۔؟ اُن کی شکل وصورت، رہن سہن، کھانا پینا یہاں تک کہ اُن کی زبان بھی ایک ہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنی 'قومیت' کو بھول کر ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ ہندوستانی ہیں یا پاکستانی۔

دراصل یہ قومیت کا تصور اُن کے ملکوں میں ہی پایا جاتا تھا۔ یہاں نارتھ امریکہ میں اس قسم کے جذبات واحساسات اور تصورات کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور وہ

ایک دوسرے سے بڑے کھلے دل سے ملتے اور شامیں تک اکٹھی گزارتے تھے۔

ان دنوں ٹورنٹو میں خال خال ہی ہندوستانی یا پاکستانی نظر آتے تھے اس لئے یہ لوگ اپنے کسی ہم زبان سے بات کرنے کے لئے ترستے رہتے تھے اور جب انہیں کوئی اچانک مل جاتا تھا تو ایسے خوش ہوتے تھے جیسے کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ تب وہاں آج کی طرح ان کی آبادی لاکھوں میں نہیں تھی بلکہ ہزاروں تک محدود تھی۔

اُن ہی دنوں کرشن گوپال بھی نیا نیا ہندوستان سے وہاں آیا تھا اور وہ یہاں اپنے کسی ہم زبان سے باتیں کرنے کے لئے ترستا تھا۔ تبھی ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ اسی بلڈنگ کی گیارہویں منزل پر محمود اشرف نامی ایک انجینئر رہتا ہے۔ اس اطلاع سے وہ بے حد خوش ہوا کہ اسی شام بغیر کسی دعوت کے یا پیشگی اپوائنٹمنٹ کے وہ اُس سے ملنے چل پڑا اور جاتے ہی جلدی سے دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنے پڑوسی سے ملنے کے لئے بیتاب ہو۔ گھنٹی بجتے ہی ایک طویل قامت گورے چٹے نوجوان نے دروازہ کھولا اور ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر حیران سا ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورتا ہوا بولا...... ''جی فرمایئے''

کرشن گوپال کو بات کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ چند ثانیوں کے لئے وہ گنگ سا ہو گیا۔ پھر بڑے دھیرے سے لہجے میں اُس نے کہا۔ 'معاف کیجئے گا۔ مَیں کرشن گوپال ہوں۔ میں چند مہینے قبل لکھنؤ سے یہاں آیا ہوں اور اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں''۔

لیکن آپ کی زبان تو لکھنوی نہیں۔ آپ تو......''

''جی آپ نے درست فرمایا۔ دراصل ہم لوگ تقسیم سے پہلے پنجاب کے شہر گوجر خان میں رہتے تھے۔''

''عجیب بات ہے'' محمود اشرف اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا...... ''میں بھی اتفاق سے اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔''

اور پھر انگریزی بولتے بولتے وہ اپنی پوٹھوہاری زبان میں بات چیت کرنے لگے۔ وہ بھول گئے کہ وہ ہندوستانی اور پاکستانی ہیں، اُن دونوں کے ملکوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو دشمن ملک تصور کرتے ہیں۔

پھر چند ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے لگے۔ حالانکہ

محمود اشرف پاکستانی تھا

اور کرشن گوپال ہندوستانی تھا

لیکن آخر اُن میں فرق بھی کیا تھا؟

وہ دونوں ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے تھے

اُن کا رنگ روپ ایک سا تھا

اُن کی زبان ایک تھی

ان کے رسم و رواج بھی لگ بھگ ایک سے تھے

وہ ایک ہی تہذیب و تمدن کے منبع سے نکلی ہوئی ندی کا حصہ تھے جو کچھ سے تک اپنی مسافت طے کرنے کے بعد دو دھاراؤں میں بدل کر الگ الگ سمتوں

میں بہنے لگتی ہے۔

پھر بھلا وہ ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو قالب ایک جان ہو گئے۔ انہیں ایک دوسرے سے بغض و عناد کی کبھی بو نہ آئی اور انہیں ہمیشہ مل کر اپنے پن کا احساس ہوا اور چونکہ اُن دنوں وہ دنوں اکیلے رہتے تھے لہٰذا اُن کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرنے لگا اور وہ ایک دسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔

کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر کرشن گوپال اشرف سے سوال کر بیٹھتا۔ ''یار اشرف! مجھے آج تک احساس تک نہیں ہوا کہ تم غیر ملکی ہو۔''

اور اشرف مذاق کے لہجے میں جواب دیتا۔ ''گوپال تُم کیوں بھول جاتے ہو کہ میں پاکستانی ہوں...... پاکستانی...... خالص پاکستانی''

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا...... ''مَیں یہاں بھی رہتے ہوئے پاکستان کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتا رہتا ہوں۔ اور وہاں کی یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر پایا۔ اور یہ خواہش ہمیشہ دل کو کچوکے لگاتی رہتی ہے کہ کیا میں کبھی گوجر خان کے بازاروں میں گھوم پاؤں گا؟ کیا مجھے مری کی برف سے ڈھکی سر بفلک چوٹیاں دیکھنی نصیب ہوں گی۔ کیا وہاں کا برف کی طرح یخ اور شیریں پانی پینا نصیب نہیں ہوگا؟''

کرشن گوپال ہمیشہ اشرف کے مذاقیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی طرح جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کہتا...... یہ سب اتفاق ہے کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا اور تُم ایک مسلم گھرانے میں۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو تم ہندوستانی ہوتے

اور میں پاکستانی۔

اشرف محمود اُسے خاموش کرانے کی غرض سے کہتا۔ 'اچھا بابا اب اپنا لیکچر بند کرو۔"

مگر کرشن گوپال پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا وہ اسی طرح جذبات کی رو میں بہتا اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا۔ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح دشمنی اور نفرت کے ماحول میں زندگی گزارتے رہیں گے ؟ کیا ہمارے ملک ایک دوسرے کے تئیں پیار اور امن وآشتی کا اظہار نہیں کریں گے۔ آج کی سیاست نے ہمیں ایک دوسرے بہت دُور کردیا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے آسانی سے مل بھی نہیں سکتے۔ بھائی بہن سے اور ماں بیٹے سے ملنے کو ترستی ہے لیکن سرحدی پابندیوں نے انہیں الگ تھلگ کردیا ہے اشرف! وہ اُسے شانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہتا۔ "کینیڈا کے لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے امریکہ چلے جاتے ہیں اور امریکہ کے لوگ کینیڈا...... انہیں کسی قسم کی دقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مگر ہم امرتسر سے لاہور اور لاہور سے امرتسر تک کا تیس میل کا راستہ طے نہیں کرسکتے۔ حالانکہ بٹوارے سے پہلے لوگ لاہور اور امرتسر کے درمیان دن میں دو دو چکر لگاتے تھے۔ اگر ملک کے قوانین ہمارے درمیان حائل ہیں تو امریکہ اور کینیڈا کے عوام کے درمیان کیوں حائل نہیں؟ وہ ایک دوسرے کے ملک میں بلا روک ٹوک کیسے چلے جاتے ہیں۔؟"

اسی طرح وقت کا پرندہ اپنی مخصوص رفتار میں اُڑانیں بھرتا رہا...... اور پھر ایک دن کرشن گوپال کے والدین بھی کینیڈا اپنے بیٹے کے پاس آگئے۔ اُن کے آجانے سے اشرف کا ان کے گھر آنا جانا اور بھی بڑھ گیا کیونکہ اسے ان میں کوئی

غیریت نظر نہ آئی اور وہ اُسے بھی اپنے بیٹے کی طرح ہی چاہتے تھے۔ کرشن کے والد فوج کے ریٹائرڈ کیپٹن تھے اور طویل مدت سے کینسر کے موذی مرض میں گرفتار تھے اور وہ دراصل یہاں اپنا علاج کرانے کے لئے آئے تھے۔ وہ بڑے خوش باش اور ملنسار تھے۔ اور بات بات پر قہقہے لگاتے تھے۔ ایک دن جب انہیں باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اشرف کے والد بھی پنجاب رجمنٹ میں صوبیدار تھے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ اسی رجمنٹ سے ہی وابستہ رہے تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اُن سے واقف نہ ہوں اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ وہ اُن ہی کے علاقے کے رہنے والے ہوں۔ انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"کیا نام تھا تمہارے والد کا؟"

"جی۔ راجہ صابر محمود"

"ارے وہی نا جن کے بڑے بھائی راجہ خالد محمود ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے"

"جی وہی"

ارے مَیں تو انہیں اسکول کے زمانے سے جانتا ہوں۔ وہ اسلامیہ اسکول کے کیپٹن تھے اور میں سناتن اسکول کا۔ ڈسٹرکٹ اسکولوں کے مقابلے میں ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اور ہماری دوستی تو اکٹھے ہاکی اسکول کے زمانے سے تھی اور فوج جائن کرنے کے بعد اتفاقاً ہماری رجمنٹ بھی ایک ہی تھی۔ لیکن بٹوارے سے پہلے اُن کی پوسٹنگ دہرہ دون میں تھی اور میری جالندھر میں۔ اس لئے تقسیم کے بعد اچانک حالات ایسے ہو گئے کہ ہم ایک دوسرے سے مل نہ پائے اور پھر ملاقات نہ

ہو سکی۔

اس واقعہ کے بعد اُن کی قربت مزید بڑھ گئی اور پھر اُن کی اس کے والد کے ساتھ خط و کتابت بھی شروع ہو گئی۔ جنہوں نے اپنے کئی خطوط میں انہیں پاکستان آنے کی دعوت دی تھی، ان خطوط کو پڑھ کر وہ بڑے جذباتی ہو جاتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے۔ ''اشرف اگر زندہ رہا تو تمہاری شادی پر میں ضرور گوجر خان جاؤں گا۔اور اس طرح تمہاری شادی میں شرکت کے ساتھ ہی اپنی جنم بھومی کے بھی درشن کرنے کی برسوں پرانی خواہش کو بھی پورا کر لوں گا۔'' ایسی باتیں کرتے کرتے وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتے اور کبھی کبھی تو اُن کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور وہ کسی نامعلوم دنیا میں کھو جاتے۔ لیکن پھر ایک دن اُن کی حالت بہت بگڑ گئی اور بیماری کی شدت کے مدنظر انہیں ہسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔

کرشن گوپال کی طرح اشرف بھی اُن کی بیماری سے بہت فکر مند تھا اور اُس کے ساتھ لگ بھگ روز ہی انہیں دیکھنے ہسپتال جایا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک اشرف کو کنگسٹن میں اپنی بہن کے یہاں جانا پڑ گیا جہاں کوئی تقریب تھی۔ اشرف چاہتا تھا کہ کرشن گوپال بھی اس کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لئے چلے مگر والد کی بیماری کی شدت کے پیش نظر اُسے اکیلے ہی جانا پڑ گیا۔ لیکن شومیِ قسمت کہ واپسی پر آتے ہوئے ایک کار کے حادثے میں وہ شدید زخمی ہو گیا لیکن بروقت ہسپتال میں پہنچ جانے سے اس کی زندگی تو بچ گئی لیکن وہ اپنی آنکھوں سے محروم ہو گیا۔

اگرچہ اس حادثے کی اطلاع پا کر اس کے بہنوئی بہن کنگسٹن سے اور کچھ رشتہ دار اسٹیٹس سے بھی پہنچ گئے تھے لیکن کرشن گوپال اُن سب سے زیادہ اس

کے لئے پریشان رہتا اور اپنا زیادہ تر وقت ہسپتال میں گزارتا۔ حالانکہ ہمیشہ اسے پاس رہنے یا ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی دوران اُس کے والد نے بھی چند بار ہسپتال سے ٹیلی فون پر اس سے بات چیت کی اور بیماری کے کارن خود نہ آسکنے پر معذرت کی اور ساتھ ہی اُس کے جلد روبصحت ہونے کی دعا کی۔

آخر کچھ دنوں کی جانچ پڑتال کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آنے کی کافی امید ہے اور اس کے لئے آئندہ ہفتے جب بھی ڈونیٹ (Donate) کی گئیں کوئی آنکھیں دستیاب ہو جائیں گی، اُس کا آپریشن کر دیا جائے گا۔

اور پھر اشرف کے اعزاء واقارب اور کرشن گوپال بے صبری سے اُس کے آپریشن کا انتظار کرنے لگے۔ اور آخر آٹھ دن بعد آنکھیں دستیاب ہو جانے پر اس کا آپریشن کر دیا گیا جو کامیاب ثابت ہوا اور اس کی بینائی دوبار لوٹا آئی۔ اس پر یوں تو سبھی کو بے حد خوشی ہوئی تھی مگر کرشن گوپال کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

چند دنوں بعد اُسے ہسپتال سے چھٹی دے دی گئی اور وہ گھر واپس آیا تو اُسے مدن گوپال جی کی یاد آئی جن کی حالت کچھ دنوں سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ اُس نے کرشن گوپال سے پوچھا۔ ''انکل کیا کیا حال ہے؟

کرشن گوپال نے جواب دیا۔ ''پہلے کی طرح چل رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

کرشن گوپال پر اُداسی کی لہر دوڑ گئی، جیسے وہ ان کی زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔ کچھ ثانیے وہ چپ سا رہا۔ پھر بولا۔'' ڈاکٹر تو آخری وقت تک امید

دلاتے رہتے ہیں

لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"حالت اطمینان بخش نہیں"

یہ سن کر اشرف بھی اُداس سا ہو گیا۔ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا "اچھا۔ تو ایسا کرتے ہیں۔ کل انہیں دیکھنے مَیں بھی تمہارے ساتھ ہسپتال جاؤں گا۔"

"لیکن ابھی تم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے اس لئے ابھی تم کچھ دن بعد جانا۔"

"ارے نہیں اب میں ٹھیک ٹھاک ہوں، اور کل تمہارے ساتھ ہسپتال ضرور جاؤں گا۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ باؤ جی نے کہا تھا اشرف کو کہنا، ابھی وہ دیکھنے نہ آئے اور کچھ دن آرام کرے۔ اور ہاں۔ باؤ جی نے تمارے نام ایک خط دیا تھا جس میں تلقین کی تھی کہ تم جب تک پوری طرح رو بصحت نہ جاؤ ہسپتال نہ آنا" اتنا کہہ کر کرشن گوپال نے جیب سے ایک خط نکالا اور اُسے تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ لو باؤ جی نے اس سلسلے میں تمہیں یہ خط لکھا تھا۔" اتنا کہہ کر اُس نے خط اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود تھکا تھکا سا پاس ہی پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اشرف نے خط کھولا اور وہیں کھڑے کھڑے اُسے پڑھنے لگا، لکھا تھا:

"پیارے اشرف! یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ڈاکٹروں نے چند دنوں

بعد تمہارے آپریشن کا فیصلہ کیا ہے اور جلد ہی تمہاری آنکھوں کی روشنی واپس آجائے گی۔ لیکن روشنی آنے کے بعد بھی کئی دن تک تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہوگی۔ اس لئے جب تک تم پوری طرح رو بصحت نہ ہو جاؤ آرام کرنا۔ اور ہاں! میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہاری اس بینائی کے واپس آنے پر مَیں کتنا خوش ہوں۔ تمہیں تو معلوم نہیں کہ ادھر ڈاکٹر بھی میری زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر اُن کے رویے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب مَیں زیادہ سے زیادہ چند دن کا مہمان ہوں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس پر حیرانی ہو۔ آخر کینسر کا مریض کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اُسے تو جانا ہی ہے۔ لہذا مَیں نے ڈاکٹروں سے استدعا کی تھی کہ اگر مَیں تمہارے آپریشن سے پہلے مر جاؤں تو وہ مہربانی کر کے میری ڈونیٹ کی گئی آنکھیں تمہیں لگا دیں۔ اس طرح ایک تو تمہیں نئی آنکھیں مل جائیں گی اور تمہاری بینائی دوبارہ لوٹ آئے گی۔ اور پھر میری برسوں کہ یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی کہ مَیں ایک بار اپنی جنم بھومی کے درشن کر سکوں۔ وہ جگہیں دیکھ سکوں جہاں میں نے اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزاری تھی مگر افسوس زندگی میں یہ ممکن نہ ہو پایا۔ چلو اب میری آنکھیں تمہارے توسط سے وہ سب کچھ دیکھ سکیں گی جنہیں دیکھنے کی خواہش لئے مَیں اس دنیا سے کوچ کر رہا ہوں۔ میں نے کرشن گوپال سے کہا ہے کہ میری موت کے بعد جب تم رو بصحت ہو کر گھر آجاؤ تو یہ خط تمہارے حوالے کر دے اور کہہ دے کہ میری خواہش کو جلد پوری کرنا اور.........."

اور اس سے آگے اشرف کچھ نہ پڑھ پایا۔ اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ پاس ہی پڑی کرسی پر دھڑام سے گر پڑا۔ ☆☆☆☆☆

مونالیزا کے آنسو

یوں تو اُس کا نام سادھنا تھا یعنی ریاضت لیکن چونکہ اُس کے دلکش اور حسین چہرے پر مسکراہٹ ہمیشہ رقصاں رہتی تھی، اس لئے اُس کے پتا مسکراتی مونالیزا کی پینٹنگ کی نسبت سے اُسے 'مسکان' کہہ کر پکارتے تھے یہاں تک کہ اُس کا اصلی نام اسکول کے ریکارڈ اور ہم جماعتوں تک محدود ہو کر رہ گیا اور وہ سب کے لئے مسکان بن کر رہ گئی۔

مسکان کو کبھی کسی نے سنجیدہ حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ ہر وقت شوخیاں اور مسکراہٹیں۔ جب وہ مسکراتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے گلشن میں اچانک ہزار ہا پھول کھل اُٹھے ہوں یا موسمِ خزاں میں بہار بھولے سے پھر لوٹ آئی ہوئی ہو۔ اُس کی مسکراہٹ کے سبھی دیوانے تھے۔ اُس کے دادا کو تو اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر انگریزی کی وہ نظم یاد آجاتی جس میں ایک شہزادی ہر بات پر مسکرا دیتی تھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتی تھی تو اُس کی لگام پکڑے سائیس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور جب خادم اُس کے سامنے کھانا پروستا تھا تو وہ اُسے دیکھ کر مسکراہٹ کی پھلجھڑیاں چھوڑ دیتی تھی۔

مسکان جب تک بچی رہی تو اُس کی مسکراہٹ پر اُس کی ماں بھی بہت خوش ہوتی تھی مگر جب اُس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اُس کی مسکراہٹ میں اسے کسی

آنے والے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ یہ بھی کیا کہ ہر بات پر مسکرانا۔ بوڑھا ہو یا جواں ہر ایک کے سامنے ہر بات پر مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے رہنا۔ اگر کسی کو کوئی غلط فہمی ہو جائے تو.......... اس لئے وہ اب کبھی کبھی اُسے اس طرح بے وجہ ہر بات پر مسکارنے پر ٹوکنے لگی تھی مگر مسکان تھی کہ اُس پر ماں کی جھڑکیوں یا سرزنش کا کوئی اثر قبول کرنے کے بجائے اُن پر بھی مسکراہٹ کے پھول بکھیر دیتی اور ماں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ مگر اندر سے وہ بہت فکرمند رہتی۔ اُس کی مسکراہٹ میں انہیں کوئی دبی ہوئی چنگاری...... کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ نظر آتا جو اُس کی زندگی میں ہلچل مچا سکتا تھا۔

اور سچ مچ ایک دن اس خطرے .کا احساس مسکان کو بھی ہو گیا اور اُس دن اُس کے منہ سے بھی بے ساختہ نکل گیا۔ 'اوہ میری مسکراہٹ اتنی خطرناک بھی ہو سکتی ہے؟'' تب اُسے اُس دن کا خیال آ گیا جب پہلے پہل کارتک اُن کے گھر آیا تھا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی فیملی کا ایک حصہ بن گیا تھا۔

''کارتک! اب کہاں ہوگا؟''

اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ اور پھر کارتک کی آمد کا وہ پہلا دن اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اُسے احساس ہوا جیسے یہ کل کا ہی واقعہ ہو حالانکہ اسے بیتے برسوں گزر چکے تھے۔

دراصل کارتک اُن کا بہت دور کا رشتہ دار تھا جو اُن کے شہر ممبئی میں نیا نیا وارد ہوا تھا اور چونکہ اُس کا یہاں اُس کی ممی کے سوا جو اُس کی بھابھی کی موسی کی لڑکی یعنی اُن کی موسیری بہن تھیں اور کوئی جانکار نہیں تھا۔ لہذا چلتے وقت بھابھی نے اُس کی ممی

کا پتہ دینے کے ساتھ ساتھ اُنہیں ٹیلی فون بھی کر دیا کہ کارتک کا دھیان رکھنا۔ یہی کارن تھا کہ بمبئی آنے کے بعد اُس نے ملازمت جوائن کرنے اور مکان کرائے پر لینے کے بعد سوچا چلو بھابھی کی بہن سے مل آئیں۔ یہی سوچ جب وہ اُن کے گھر پہنچا اور بیل بجائی تو اتفاق سے مسکان نے ہی دروازہ کھولا۔ اور لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ''جی۔ کس سے ملنا ہے؟''

کارتک نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ''مَیں دہلی سے آیا ہوں اور سویتا بھابھی نے مجھے......''

''اچھا اچھا! آپ سویتا موسی کے دیور ہیں؟''

''جی''

''تو آیئے نا۔'' ہم کئی دنوں سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

''آپ......''

''جی'' وہ مسکرا پڑی 'میرا مطلب ہے۔ ممی اور پاپا..........''

''اچھا اچھا۔ تو کہاں ہیں سب لوگ؟''

''وہ ذرا مارکیٹ تک گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔''

وہ بیٹھ کر اُن کا انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چائے لے کر آ گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ میز پر رکھے ''ہندوستان ٹائمز'' کی خبروں پر سرسری نگاہ ڈالنے لگا کیونکہ اخبار تو وہ صبح ہی پڑھ چکا تھا۔ ایسے ہی انتظار کرتے کرتے جب ایک گھنٹہ بیت گیا، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اب مَیں چلتا ہوں، اگر موقع ملا تو پھر کسی دن آ جاؤں گا۔''

''نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ ممی کو آپ سے نہ ملنے کا بہت افسوس ہو گا۔''

لیکن اب اُس میں مزید انتظار کی تاب نہ تھی لہذا وہ اُٹھ کر باہر کی طرف بڑھا اور وہ بھی اُسے چھوڑنے گیٹ تک گئی مگر جوں ہی انہوں نے گیٹ کھولا سامنے سے اُس کے ممی ڈیڈی بھی آ گئے اور کار سے اُترتے ہوئے اُس اجنبی نوجوان کو گیٹ پر دیکھ کر حیران حیران سوالیہ آنکھوں سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھنے لگے۔ اُن کی نظروں کی زبان سمجھ کر وہ بولی۔ ''ارے ممی یہ کارتک جی ہیں سویتا موسی کے دیور۔''

''ارے تو تم ہی کارتک ہو؟'' چلو چلو۔ اندر چلو یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''نہیں آنٹی۔ اب دیر ہو رہی ہے پھر کسی دن......

''ارے ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ کھانا کھائے بغیر کیسے جا سکتے ہو؟ چلو چلو اندر چلو۔'' اور وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر کمرے میں لے آئیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے لنچ کئے بغیر جانے نہ دیا اور تاکید کی وہ ہر چھٹی کو یہاں آ جایا کرے۔

ایک تو اُن کا اصرار دوسرے مسکان کے چہرے پر رقصاں مونا لیزا کی مسکراہٹ۔ اُس نے ایسا جادو کیا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چھٹی والے دن اُن کے گھر پہنچ جاتا۔ اور مسکان اور اُس کے چھوٹے بھائی سدھیر کے ساتھ تاش یا کیرم کھیلتا رہتا۔ مگر اُس کی نظریں ہمیشہ مسکان کے گلاب کی طرح کھلے چہرے اور مسکراتی آنکھوں پر جمی رہتیں، اُس کا جی چاہتا وہ اگر موقع ملے تو کبھی اُس سے اپنے دل کی بات کہے کہ وہ اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے......اُس کی خواہش ہے کہ وہ اُس سے زندگی بھر کا رشتہ قائم کرے۔ مگر یا تو موقع نہیں ملتا تھا اور اگر ملتا تھا تو الفاظ اُس کا ساتھ نہیں دیتے تھے، زبان قوت گویائی سے محروم ہو جاتی تھی۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن جب وہ حسبِ معمول اُن کے گھر پہنچا

تو وہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ کچھ مہمان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔ تبھی نیلم آنٹی نے اُسے بیٹھے ہوئے بزرگ مہمانوں سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ "آؤ۔ آؤ کارتک! یہ مسکان کے ہونے والے ساس سسر ہیں، شادی کی تاریخ پکی کرنے آئے تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ "اگلے مہینے کی بیس تاریخ شادی کا مہورت نکلا ہے۔ مسکان کا منگیتر راہل جو منگنی کے بعد بزنس کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا تھا اگلے مہینے واپس آجائے گا۔"

آنٹی کی باتیں سُن کر اُسے ایسے محسوس ہوا جیسے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے اور زمین نے اس تیزی سے گردش شروع کر دی ہے کہ اُسے زمین آسمان گھومتے سے محسوس ہونے لگے ہیں۔ تاہم اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور مسکان کے ہونے والے ساس سسر کو نمستے کر کے اُن کے پاس بیٹھ گیا۔ نیلم اب بھی بولے جا رہی تھی۔ "کارتک اب شادی میں بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ تمہیں انکل اور سدھیر کا ہاتھ بٹانا ہے اور سارے کاموں میں ہماری مدد کرنی ہے۔"

کارتک بھی اب سنبھل چکا تھا۔ اُس نے بھی چہرے پر خوشی کے تاثرات لاتے ہوئے کہا کیوں نہیں آنٹی۔ آپ فکر نہ کیجئے، سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد وہ کوئی آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھا شادی کے پروگراموں میں اپنی تجاویز پیش کرتا رہا۔ مگر اندر ہی اندر اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ اس ناگہانی انکشاف پر اندر سے ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ اکیلے میں نہ جانے کیوں اُداس اُداس سا ہو جاتا تھا۔ وہ کئی بار سوچتا۔ آخر اُسے کیا حق تھا کسی ایسی لڑکی سے من ہی من پریم کرنے کا جسے پتہ بھی نہیں کہ وہ اس کی مسکراہٹوں کے جادو سے اُس کو دل ہی دل

میں چاہنے لگا تھا۔

شادی کے دنوں میں وہ اُسی طرح حسبِ معمول مسکان کے گھر جاتا اور ہر طرح کے کاموں میں اُن کی امداد کرتا۔ مگر اب وہ مسکان کو ملنے سے گریز کرتا۔ اُس سے پہلے کی طرح باتیں بھی نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اُس کا سامنا بھی نہ ہو۔ مسکان اس کی اس تبدیلی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک دن اُسے کچھ سامان لینے مارکیٹ جانا تھا، سدھیر کہیں گیا ہوا تھا اس لئے نیلم آنٹی نے اُس سے کہا کہ وہ مسکان کے ساتھ ذرا مارکیٹ چلا۔

کارتک چاہتا تو نہیں تھا کہ اُسے مسکان کے ساتھ تنہا مارکیٹ جانا پڑے لیکن وہ انکار بھی تو نہیں کر سکتا تھا اس لئے بنا انکار کئے وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے بھر کارتک خاموش رہا۔ آخر مسکان نے خاموشی توڑتے ہوئے۔

''کارتک! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ آج کل تم جب بھی ملتے ہو اُداس اُداس سے دکھائی دیتے ہو۔''

کچھ بھی تو نہیں''

کچھ تو ہے؟

''کارتک کے چہرے سے اُداسی صاف چھلک رہی تھی۔ جسے دیکھ کر مسکان بھی ایک لمحہ کے لئے اُداس سی ہو گئی۔ پھر اس نے خود ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب سے تم نے میری شادی کی خبر سنی ہے تم اُداس ہو گئے ہو۔ لیکن کارتک۔ .... کبھی موقع ہی نہیں ملا کہ میں تمہیں بتاتی کہ راہل میرا بچپن کا دوست ہے۔ میری اُس سے منگنی تمہارے آنے سے بہت عرصہ

پہلے ہو چکی تھی۔ اور وہ میرا برسوں کا ساتھی ہے۔ ہم نے جیون بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔ میری غلطی یہ ہے کہ مَیں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ مَیں تمہیں ایک بہت اچھا دوست سمجھتی ہوں...... صرف دوست۔ لیکن شاید تم.................

کارتک اُس کی باتوں سے کچھ سنبھل سا گیا۔ اور بولا۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ مسکان۔ یہ میری غلطی ہی تھی...... لیکن مَیں کیا کروں، نہ جانے تم مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہو۔ تمہاری مسکراہٹوں نے مجھ مسحور کر دیا ہے اور..........."

مسکان کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "مسکراہٹ تو میرا سبھاؤ بن گیا ہے۔ مجھے تو ہر بات پر مسکرانے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اور اگر کوئی غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو اس میں میرا کیا قصور؟

کارتک اُٹھ کھڑا۔ "مسکان معاف کر دو، ہم اچھے دوست تھے اور دوست ہی رہیں گے۔ چلو اب گھر چلو۔"

پھر دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کی جانب روانہ ہو گئے مگر راستہ بھر دونوں نے کوئی بات نہیں کی جیسے دونوں کی زبان پر تالے لگے ہوئے ہوں۔ مسکان کو آج پہلی بار اپنی مسکراہٹ پر ممی کی وہ تنبیہ یاد آگئی۔ "مسکان! یہ ہر وقت...... ہر بات پر مسکرانا چھوڑ دو۔ کہیں کوئی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تو..............؟

شادی کے دن بھی کارتک ہر کام میں گھر والوں کے ہاتھ بٹاتا رہا اور کسی کو احساس تک نہ ہو سکا کہ اُس کے اندر کیا طوفان موجزن ہے۔ صبح جس وقت ڈولی کی رخصتی ہو رہی تھی اُس وقت پہلی بار مسکان کی زندگی میں اداسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ویڈیو کیمرے اور اسٹل کیمروں سے اُس کی رخصتی کی فلم اور تصویریں بنائی

جارہی تھیں۔ کارتک نے بھی اپنا چھوٹا سا کیمرہ نکالا اور رخصت ہوتی ہوئی مسکان کی تصویر اُتارتے ہوئے کہا۔ ''مسکان ذرا مسکراؤ تو......'' مگر جوں ہی اُس نے کیمرہ کلک کیا تو مسکان کی مسکراہٹ نے آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے باہر آ کر اُس کے گالوں پر لڑھکنا شروع کر دیا اور وہ دل پذیر منظر کیمرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید ہو کر رہ گیا۔

معلوم نہیں یہ آنسو اُس کی بد قسمتی پر نوحہ کناں تھے یا ماں باپ سے جدائی کے غماز؟ تاہم وہ ایک ایسی یادگار تصویر تھی جس میں مسکان نے زندگی میں پہلی بار آنسو بہائے تھے۔

☆☆☆☆☆

مصنف کے سوانحی حالات

نام: نند کشور دت

قلمی نام: نند کشور وکرم

ولادت: ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء راولپنڈی شہر (پاکستان)

تعلیم: بی اے (۱۹۵۶ پنجاب یونیورسٹی)

ایم اے فارسی (۱۹۵۸ء پنجاب یونیورسٹی)

ایم اے اُردو (۱۹۶۶ء دہلی یونیورسٹی)

ادیب فاضل

ملازمت: ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو سنٹرل انفارمیشن سروس سے سبکدوش۔

شادی: ۱۱ر مئی ۱۹۶۱

اہلیہ: آشادت

بچوں کے نام: تین بچے رتو ملہوترا (بیٹی) وکاس دت (بیٹا) جوہی بالی (بیٹی)

پہلی تخلیق: دسمبر ۱۹۴۷ء میں افسانہ ''ادیب'' ماہنامہ 'نرالا' نئی دہلی میں شائع ہوا۔

صحافت: ۱۹۴۸ء میں کانپور میں میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ 'قومی اخبار' اور 'امرت' سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء میں کانپور ہی

سے دیویندر اسر کے اشتراک سے "ماہنامہ ارتقاء" کا اجراء کیا جو بوجوہ بند
ہو گیا، ۵۴-۱۹۵۳ء میں نئی کہانی کی ادارت کی۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۹ء
سرکاری رسالے "آج کل" نئی دہلی میں بحیثیت سب ایڈیٹر/اسسٹنٹ
ایڈیٹر وابستہ رہے۔ اب ۱۹۸۵ء سے اُردو کے واحد حوالہ جاتی مجلّے "
عالمی اُردو ادب" کی ادارت کر رہے ہیں۔

انعامات و اعزازات: ۱۹۷۰ء میں "کواپریٹو ڈیری" پر وزارتِ زراعت، حکومت ہند کا
انعام

۱۹۷۳ء میں "سفید انقلاب" مسودے پر وزارتِ زراعت حکومت ہند کا انعام

۱۹۸۱ء میں ناول "یادوں کے کھنڈر" پر اُتر پردیش اُردو اکادمی اور مغربی
بنگال اُردو اکادمی کا انعام۔

۱۹۹۸ء میں افسانوی مجموعے "آوارہ گرد" پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام۔

۲۰۰۱ء میں تجزیاتی ناول "انیسواں ادھیائے" پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام
جو قبول نہیں کیا۔

اُردو سے ہندی میں ترجمے پر انوواد پریشد نئی دہلی کا ۹۹-۱۹۹۸ء کا
دوی واگیش پرسکار

۱۹۹۶ء میں ہندی میں تخلیقی ادب اور صحافت میں نمایاں کارکردگی پر "سنگھ
کی آواز" کی جانب سے فکی آڈیٹوریم نئی دہلی میں اعزاز دیا گیا۔

بیرونی ممالک کا دورہ: فرانس، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور نیپال

مطبوعات:

اُردو: غالب: حیات و شاعری (۱۹۶۹ء) کواپریٹو ڈیری (۱۹۶۹ء) یادوں کے
کھنڈر (۱۹۸۱ء) محمد حسین آزاد (۱۹۸۲ء) آوارہ گرد (افسانے ۱۹۹۸ء)

انیسواں ادھیائے (۲۰۰۱ء) منتخب افسانے ۱۹۸۴ تا منتخب افسانے ۲۰۰۲ء (ہر سال کا انتخاب)

ھندی: یادوں کے کھنڈر (ناول۔ ۱۹۶۱ء)

آوارہ گرد (افسانے۔ ۲۰۰۰)

انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول۔ ۲۰۰۳ء)

تراجم:

اُردو سے ہندی: آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر کا ناول۔ ۲۰۰۰)۔ تصویریں (سعادت حسن منٹو کے تحریر کردہ خاکوں پرمبنی کتاب کا ترجمہ و تدوین (۲۰۰۱ء) پاکستان کی شریشٹھ اُردو کہانیاں، اُردو کی سروشریشٹھ کہانیاں، اُردو کی سروشریشٹھ ہاسیہ کہانیاں کے علاوہ اُردو کتھا کار سیریز کے تحت پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، دیوبندر ستیارتھی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، اپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہنس راج رہبر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، رام لعل، ممتاز مفتی، انتظار حسین۔ وغیرہ پر کتابیں۔ نیز "شاعری اور جیون" کے تحت سیریز میں، غالب، حبیب جالب، ساحر لدھیانوی اور سردار جعفری وغیرہ پر کتابیں

ہندی سے اُردو: گرہ داہ (شرت چندر چٹرجی کا ناول (۱۹۷۱ء) گوکھ یاترا (۱۹۹۱ء) جلیاں والا باغ وغیرہ۔

پنجابی سے اُردو: نہ رادھا نہ رکمنی (امرتا پریتم کا ناول) جنگی قیدی (کیسر سنگھ کا ناول)

انگریزی سے اُردو: گیانی ذیل سنگھ (۱۹۹۱ء) یوسف مہر علی (۲۰۰۴)

یہ داستاں رہے گی ادھوری مرے بغیر
مَیں آخری ورق ہوں مجھے پھاڑنا نہیں

نند کشور وکرم

مت سمجھنا کہ مجھے آگ جلا سکتی ہے
مَیں تو ققنس کی طرح راکھ سے پھر جنموں گا

نند کشور وکرمؔ